طلوع اسلام

اکتوبر ۱۹۵۱

بیادگار اقبال

8

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ کراچی
اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ کراچی

تشریف لائیے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہ نور نٹنگ ملز۔ کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے۔ نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیاز آگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۴	اکتوبر ۱۹۵۱ء	نمبر ۱۰

فہرستِ مضامین

لمعات	۵ - ۹	نسخہ اور اس کا استعمال	۳۵ - ۴۰
نظم (اقبالؒ)	۱۰	ماڈرن مُلّا	۴۱ - ۴۷
نجات (پرویز صاحب)	۱۱ - ۲۹	تار یا مضراب	۴۸ - ۵۷
		حج کی اہمیت (پرویز صاحب)	۵۸ - ۶۱
ثواب (پرویز صاحب)	۳۰ - ۳۴		

(ادارہ طلوعِ اسلام کراچی)

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز صفحات ۴۰۰

مجلد - قیمت چار روپے

ادارہ طلوع اسلام - رالبسن روڈ - کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم جب قرآن اور تاریخ میں یہ پڑھا کرتے تھے کہ عرب مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیا کرتے تھے تو یقین نہیں آیا کرتا تھا کہ ایسے بے رحم اور شقی والدین بھی ہو سکتے ہیں جو کسی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو، اپنی اولاد کو خود قتل کر دیں۔ آج بالآخر ہمیں اس کا یقین ہو گیا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج ہم اپنے ہاتھوں اپنی عزیز ترین اولاد کو قتل کر رہے ہیں، یعنی ہم آج اعلان کر رہے ہیں کہ ہم مجبور ہو چکے ہیں کہ طلوع اسلام کی اشاعت بند کر دیں۔

فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ دسمبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت کے بعد طلوع اسلام کی اشاعت ملتوی کر دی جائے۔ قرآن نے جب عربوں کی اس رسم اولاد کشی کا ذکر کیا تھا تو ساتھ ہی اس کا علاج بھی بتا دیا تھا کہ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷/۳۱) کہ ان بچوں کو قتل نہ کرو، ان کے اور تمہارے رزق کی ذمہ داری اللہ (نظام) کے سپرد ہے۔ لیکن آج جب کہ ہمارا نظام افراد نظام کے رزق کی ذمہ داری لینے سے قاصر ہے تو ایسے حوادث کا صادر ہو جانا کہ والدین اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں ہلاک کر دیں، تعجب ناک نہیں۔

کہنے کو تو ہم نے یہ جملہ کہہ دیا ہے کہ طلوع اسلام کی اشاعت بند کیجا رہی ہے لیکن اس اعلان سے ہمارے دل پر کیا قیامت گزری؟ اس کا اندازہ ہمیں لگا سکتے ہیں۔ ہم نے آج تک نامساعد حالات کا تذکرہ چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گو طلوع اسلام کی چہار سالہ پاکستانی حیات میں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں اس کے بچ نکلنے کی امید پیدا ہوئی ہو، تاہم ہم نے تنہا مصائب و نوائب کا مقابلہ کیا اور صبر و استقامت سے بقول اقبال

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

ہم نے اس داستان زہرہ گداز میں قارئین و معاونین کو شریک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آج چند سطور اضطراراً سپرد قلم ہو رہی ہیں۔

در سینہ تا بچند برآرم فرو برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

طلوع اسلام نے تحریکِ پاکستان کے لئے کس جاں سپاری سے کام کیا، اس کا اندازہ داں بے شمار ہیں اور اس پر شاہد اس کے دورِ اول یعنی ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک کی مجلدات ہیں۔ ایام تحریک میں طلوع اسلام ہراول دستے کا سرخیل تھا اور غیر منقسم ہندوستان میں اس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کے مضامین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا کرتے تھے

اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجایا کرتے تھے۔

وہ دور بہر حال ہنگامہ پرور دور تھا اور اس وقت مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مدار نعرہ بازی تھا۔ قیام پاکستان کو ہماری ملی ہستی کا وہ دور ختم ہوگیا اور ہمارے ملی تقاضے بدل گئے۔ نعرہ باز مسلمان جنہوں نے لڑکر نہیں بلکہ نعرے لگا کر اور ووٹ دیکر پاکستان حاصل کیا تھا، اس تبدیلی احوال سے مطابقت کی اہمیت پیدا نہ کرسکے۔ وہ بالعموم سنجیدہ گفتاری کی نعمت سے محروم ہیں۔ طلوع اسلام کہ جس کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ وہ ملی مسائل کو قرآن کی روشنی میں دیکھے، ان حقائق سے کیسے ناآشنا رہ سکتا تھا کیونکہ قرآن نعروں سے کوسوں دور لے جاتا ہے اور ٹھوس حقائق کی طرف دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام نے روزِ اول سے یہی اسلوب اختیار کیا۔ اور دورِ اول میں بھی یہی اس کا طرہ امتیاز تھا۔ کہ وہ مسائل و معاملات زندگی میں صرف قرآن کو محکم بنائے اور اسی کو قوت قلب و دماغ کو مستنیر کرے۔ چنانچہ گذشتہ چار برس میں جو کچھ ہم نے کیا وہ اسی جذبہ سے سرشار ہو کر کیا اور خالصتہً لوجہ اللہ کیا کہ کوئی اور جذبہ ہمارے نزدیک شرک کے مترادف ہے۔ اس میں جو کچھ صحیح اور درست تھا وہ قرآن اور صرف قرآن کے تصدق میں تھا، اور جو کچھ غلط تھا اس کے ذمہ دار ہم خود تھے۔

اس اسلوب دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں جو اپنے مسائل حیات سے یکسر غفلت برتنے کے عادی ہو چکے ہیں، طلوع اسلام ویسا مقبول نہ ہوسکا جیسا کہ وہ دورِ اول میں تھا۔ مزید برآں پاکستان بن جانے اور مسلمانانِ ہند کے ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہو جانے سے طلوع اسلام کا دائرہ اشاعت صرف پاکستان تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ہندوستان میں طلوع اسلام کی مانگ ضرور رہی اور وہاں کے قارئین کے برابر تقاضے موصول ہوتے رہے۔ چنانچہ ہم نے حتی الوسع پرچے بھیجنے سے انکار نہیں کیا اور چونکہ ادھر سے پیسے آنے کی کوئی صورت نہیں، اس لئے ایسے تمام پرچے مفت گئے اور جا رہے ہیں۔

اس نامساعدت حالات سے طلوع اسلام کو کم از کم ڈھائی ہزار روپے سالانہ کا نقصان برداشت کرنا۔ اس طرح گذشتہ چار سال کے کم عرصے میں مجموعی خسارے کا اندازہ کم از کم دس ہزار روپے ہے۔ یہ خسارہ کیسے برداشت ہوتا رہا؟ اس کی تفصیل میں جانا بیسود ہے۔ ہم یہ داستان چھیڑ کر قارئین کو ناحق پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ طلوع اسلام کا یہی حال رہا کہ

کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے
گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے

ابتداً طلوع اسلام کی قیمت ایک روپیہ فی پرچہ تجویز کی گئی تھی اور دو سال یہی اس کی قیمت رہی۔ لیکن چونکہ بیشتر قارئین کا تقاضا تخفیف کا تھا، اس لئے ہم نے مجبوراً باوجود اس امر کے کہ ایک روپیہ فی پرچہ کے حساب سے بھی نقصان ہوتا تھا، رسالے کی قیمت نصف کردی۔ اس تخفیف سے اشاعت پر اچھا اثر پڑا لیکن خسارے کی رفتار وہی رہی اور اس کی کچھ تلافی نہ ہوسکی۔ اخبارات و جرائد کی آمدنی کا معتد بہ حصہ اشتہارات ہوتے ہیں اور درحقیقت اشتہارات ہی ان کی زندگی کا سہارا ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام کبھی کاروباری پرچہ نہیں رہا۔ چنانچہ

دہلی کے دور میں اس میں مطلقاً اشتہارات شائع نہیں ہوتے تھے۔ یہاں آکر بعض مخلص احباب نے ادھر توجہ دی اور طلوع اسلام کو چند اشتہارات بھی میسر آگئے لیکن وہ یکسر ناکافی تھے۔

پاکستان میں طلوع اسلام کا اجراء کیا گیا تھا تو یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ چار سال کے اندر ہی یہ دم توڑ بیٹھے گا۔ ہمیں توقع تھی کہ پاکستان جن مسائل مہمہ سے دوچار ہوگا ان میں طلوع اسلام گراں قدر خدمات سرانجام دے سکیگا اور یہی امر اس کے جاری اور زندہ رہنے کا متقاضی و ضامن ہوگا۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مسلمانوں کے پاس ابھی اتنی فرصت نہیں کہ حیاتِ ملی کے مسائل مہمہ کیطرف توجہ دے سکیں۔ بہرکیف اس مختصر مدت حیات میں طلوع اسلام نے بساط بھر ملی مسائل کو قرآن کے مرکز کیطرف لانے کی کوشش کی۔ اس میں خصوصیت سے قابل ذکر کوشش یہ ہے کہ طلوع اسلام نے بڑی محنت سے اسلامی نظام کے تصور کو قرآنی روشنی میں واضح کیا اور بالآخر اس سال کے شروع میں اسے ایک آئینی صورت میں دستور پاکستان کے نام سے مجلس دستور ساز کو پیش کیا۔ ابھی یہ مسئلہ زیر غور ہے۔ یہ اور دیگر بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں طلوع اسلام کو اپنی قرآنی بصیرت کے نتائج ملت کے سپرد کرنے تھے۔ لیکن طلوع اسلام اس محفل سے رخصت ہو رہا ہے۔

شبِ ایں انجمن آراستم من
چو مہ از گردشِ خود کاستم من
حکایت از تغافل ہائے تو رفت
ولیکن از دہاں برخاستم من

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اور جیسا کہ طلوع اسلام کی تحریرات کو ایک ایک لفظ سے ہویدا ہے۔ طلوع اسلام نے جو کچھ کیا خالصتہً لوجہ اللہ کیا اور اپنے کئے کو قرآن اور صرف قرآن ہی کی میزان میں تولا کہ

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

ہم اپنی کوشش کو بارگاہ صمدیت میں پیش کرتے ہیں جہاں سوت کی اٹی بھی ارز مند ہو جاتی ہے۔ اب جبکہ نامساعدت حالات غایت بیرحمی سے ہمارے ہاتھ سے قلم چھین رہے ہیں ہم ملت کے معاملات کو اسی کے سپرد کرتے ہیں کہ اس کی مشیت اور نصرت کے بغیر نہ تزکیہ (GROWTH) ممکن ہے نہ فلاح (ACHIEVEMENT)۔ ہم فی الحال آپ سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ فرقت عارضی ہوگی دائمی نہیں انشاء اللہ العزیز

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بوئے گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی

رخصت ہونے سے پیشتر ذرا معاملے کی دو ایک باتوں کو نپٹا لیجئے۔ دسمبر ۱۹۵۱ء تک طلوع اسلام شائع ہوگا اور اس کے بعد اس کی اشاعت

ملتوی ہو جائے گی۔ اسی طرح بعض احباب جن کی میعاد خریداری دسمبر کی حد سے تجاوز کرتی ہے، ان کے چندے ہمارے ذمے واجب الادا ہونگے جب دہلی میں طلوع اسلام کی اشاعت ملتوی کی گئی تھی تو اسوقت بھی ایسا ہی کیا گیا تھا کہ جن حضرات کے چندے طلوع اسلام کے ذمے بقایا تھے وہ ادا کر دیئے گئے تھے۔ اب بھی یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو چندے ہمارے ذمے بقایا ہیں وہ ادا کر دیئے جائیں گے۔ لہٰذا جنوری ۱۹۵۲ء میں آپ از رہ کرم ہمیں یہ اطلاع دیدیجئے کہ آپ کا کتنا چندہ ہمارے ذمے ہے تاکہ وہ بیباق کر دیا جائے۔ آپکو اطلاع بھیجنے کی زحمت اس لئے دیجارہی ہے کہ حساب میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے۔ ورنہ اگر آپ نے اطلاع نہ بھیجی تو ہم اپنے حسابات کے مطابق بقایا رقوم ادا کر دینگے۔ اس کے بعد بھی اگر حساب میں غلطی رہ جائے تو آپ ہمیں اطلاع دیکر حساب صاف کرا لیجئے گا۔

طلوع اسلام کے پیش نظر وسیع اشاعتی تجاویز تھیں جنہیں جبراً قہراً ملتوی کرنا پڑا۔ پاکستان میں دو ایک پمفلٹوں کے علاوہ سلسلہ معارف القرآن کی چوتھی جلد (معراج انسانیت) ادارہ کیطرف سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب، جیسا کہ اس کا کئی مرتبہ تعارف کرایا جاچکا ہے، صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کی سیرت طیبہ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے قرآن کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے کوئی نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اعلیٰ درجے کا سفید چکنا کاغذ استعمال کیا ہے، مجلد ہے اور گردپوش منقش ہے۔ اس کی قیمت -/۲۰ روپے ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ اس کے نکاس سے طلوع اسلام کے خسارے کی تلافی کی ایک صورت نکل سکتی ہے، یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان تین مہینوں یعنی اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۱ء میں اس کتاب کو رعایتی قیمت پر یعنی صرف -/۱۲ (بارہ) روپے میں فروخت کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ رعایت صرف تین ماہ کے لئے ہے اور تاجروں کے لئے نہیں، بلکہ عام خریداروں کے لئے ہے۔ اگر آپ نے اب تک قیمت کی زیادتی کیوجہ سے اس کا خریدنا ملتوی کر رکھا تھا تو اب موقع ہے کہ آپ اس رعایتی قیمت پر اسے خرید لیجئے، قیمت بہر حال پیشگی بھیجئے۔

معراج انسانیت کیساتھ تاریخ رسالت (یعنی معارف القرآن جلد سوم) کی قیمت میں بھی اسی وجہ سے رعایت کر دی گئی ہے۔ اس کی رعایتی قیمت -/۱۷ روپے کے بجائے صرف -/۱۰ روپے ہوگی۔ یہ جلد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر کے انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے اور اس کا ماخذ بھی قرآن اور صرف قرآن ہے۔

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کے اسم گرامی سے کون شخص واقف نہ ہوگا۔ قارئین طلوع اسلام کو ان سے خصوصی تعارف حاصل ہے کیونکہ علامہ موصوف کے رشحات قلم اکثر زینت وہ اوراقِ طلوع اسلام بنتے رہے ہیں۔ موصوف قرآن پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور اس اعتبار سے آپ کی ذاتِ گرامی پاکستان اور ہندوستان میں مغتنمات میں سے ہیں۔ قرآن کے علاوہ علم و ادب میں بھی آپ خصوصی دستگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے مضامین میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے اور ہر میدان میں آپ اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

جہاں طلوع اسلام کو اکثر اپنے ہاں ان کے مضامین کی اشاعت کی سعادت حاصل رہی ہے، وہاں اب طلوع اسلام کو یہ سعادت

بھی حاصل ہوگئی ہے کہ ان کے مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کرے۔ قارئین یہ سن کر یقیناً خوش ہوں گے کہ ہم نے ان کے مضامین کتابی صورت میں شائع کر دیئے ہیں۔ اس مجموعے کا نام "نوادرات" ہے۔ حجم بڑا اور ضخامت چار سو صفحات ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔ یہ مضامین وہ ہیں جو علامہ موصوف نے وقتاً فوقتاً لکھے اور اب آپ نے انہیں نظر ثانی کرکے ہمیں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا۔ مضامین قرآنی بھی ہیں، تاریخی بھی، علمی بھی اور ادبی بھی، جو صاحب کتاب کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا آئینہ ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ قارئین اس مجموعہ مضامین کا کماحقہٗ خیر مقدم کریں گے۔

نوٹ:۔ ادارہ کو جس ترتیب سے فرمائشیں موصول ہوں گی، اسی ترتیب سے ان کی تعمیل کی جائیگی۔

طلوع اسلام کے کاتب اس مرتبہ ایک معذوری کے باعث پورا رسالہ نہ لکھ سکے۔ ان کی خلاف توقع اور اچانک غیر حاضری میں کسی اور کاتب کا بروقت انتظام نہ ہو سکا۔ چنانچہ تاخیر سے بچنے کے لئے یہ پرچہ بہتر ۷۲ صفحات کی بجائے چونسٹھ ۶۴ صفحات کا شائع کیا جا رہا ہے۔ ہم اس کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

معراجِ انسانیت (معارف القرآن۔ جلد چہارم)

رعایتی قیمت۔ بارہ ۱۲ روپے

تاریخِ رسالت (معارف القرآن۔ جلد سوم)

رعایتی قیمت۔ دس ۱۰ روپے

نوادرات (مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

قیمت۔ چار ۴ روپے

تیری تقدیر

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے نے گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالہ بے باک میں ہے
یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے
کیا عجب میری نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

(اقبالؒ)

نجات

(پرویز)

دنیائے مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تگ وتاز کا منتہیٰ کیا ہے؟ انسان اپنے آپ پر اسقدر جانگسل پابندیاں کیوں عائد کرتا ہے؟ یہ اسقدر کمر شکن مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے؟ یہ بھوک اور پیاس کی جگر سوز سختیاں، یہ مال اور جان کی ہوش ربا قربانیاں۔ یہ سفر اور حضر کے جانگداز مراحل۔ یہ گریۂ نیم شبی اور آہ سحری کے صبر آزما منازل۔ یہ تمام جدوجہد، یہ ساری سعی وکاوش بالآخر کس غرض وغایت کیلئے ہے؟ آپ کسی مذہب پرست انسان سے پوچھئے۔ ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ملے گا۔ یعنی اس تمام تگ وتاز کا مقصود، اس کدوکاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ کسی طرح نجات حاصل ہوجائے۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی۔ یہودی۔ پارسی۔ ہر ایک کی مذہبی سعی وکاوش کا مطمحِ نگاہ ایک لفظِ نجات کے اندر مضمر ہے۔ اسی کیلئے دعائیں ہیں۔ اسی کے لئے التجائیں۔ یہی تمام آرزوؤں کا مرکز ہے۔ یہی سب تمناؤں کا محور۔ آہِ سحرگاہی ہے تو اسی کے لئے اور نالۂ شبگیر ہے تو اسی کی خاطر۔ جھکتی ہوئی پیشانیوں کی سجدہ ریزیاں اور لرزتے ہوئے قلوب کی نرم خیزیاں۔ دمکتی ہوئی آنکھوں کی شبنم فشانیاں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کی تسبیح خوانیاں، سب اسی ایک مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی ایک منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ برہمن کے ناقوس میں ملّا کی اذان میں، گرجہ کی بانگِ جرس میں، صومعہ کی پکاریں، ہر جگہ اور ہر مقام پر اسی محملِ لیلیٰ کی تلاش اور اسی ناقۂ سلمیٰ کے سراغ کی تپش وخلش پنہاں ہے۔ نجات حاصل ہوگئی تو سب کچھ مل گیا۔ اور، سب کچھ ملنے پر بھی نجات کی طرف سے ناامیدی رہی تو کچھ بھی نہ ملا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نجات سے مقصود کیا ہے؟ اس لفظ کو تو ہم ہزار بار سنتے ہیں لیکن بالآخر اس کا مفہوم کیا ہے؟

ہندو دھرم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ جنم میں کسی سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس کا نام آواگون (یا تناسخ) ہے۔ جب تک اس سے گناہ سرزد ہوتے رہیں گے، یہ چکر قائم رہے گا۔ انسان کی تگ ودو کا ماحصل یہ ہے کہ یہ کسی طرح اس آواگونی چکر سے مخلصی حاصل کرلے۔ اسی کا نام ان کے نزدیک نجات (مُکتی) ہے۔ یہ رہا ان کا دھرم (یا شریعت)۔ ان کے یوگ (طریقت یا تصوف) میں عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی آتما (روح) درحقیقت پرماتما (روحِ مطلق۔ خدا) کا ایک حصہ ہے جو اپنے کُل کے الگ ہوکر، پراکرتی (مادہ) کی کیچڑ میں آپھنسی ہے۔ آتما کا اپنے آپ کو اس مادی دلدل سے نکال کر، پھر سے اپنی اصل کے ساتھ جاملنا مقصودِ حیات ہے۔ جب آتما اس طرح اپنے آپ کو مادی تلویث سے چھڑالیتی ہے تو اس کا نام مکتی یا نجات ہوتا ہے۔

بدھ مت کے نزدیک بھی نجات کا یہی تصور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی روح اس دنیا کے جیل خانے میں پھنس چکی ہے جس میں

ہر طرف کشش وجاذبیت کے پھندے پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ جوں جوں آرزوئیں بڑھتی جائیں گی، تکالیف میں زیادتی ہوتی جائے گی۔ اس لئے تکلیف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آرزوؤں کو ترک کر دیا جائے۔ جب آرزوئیں کلیتہً فنا ہو جائیں گی تو انسان کی روح تکالیف کے بندھن سے آزاد ہو کر نروان حاصل کرلے گی، جہاں کامل سکوت وسکون ہوگا۔ اسی کا نام نجات ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ (آدم وحوا) کے گناہوں کو ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے اور ان کی پاداش میں دنیا کی تکالیف بھگتتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اعمال کی بدولت اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دیدی تاکہ وہ نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ لہٰذا انسانوں کے لئے اس "ازلی مصیبت" سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کے پیدائشی گناہ سے نجات دلا کر جنت میں داخل کر دے گا۔ اسی کا نام ان کے ہاں نجات (Salvation) ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ قوم اپنے مورثینِ اعلیٰ کے بعض جرائم کی پاداش میں چند دن جہنم میں رہے گی۔ اس کے بعد جہنم کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس کا نام نجات ہے۔

مجوسیوں (پارسیوں) کے نزدیک انسان اس دنیا میں اہرمن ویزداں (نور وظلمت۔ خیر وشر) کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اس کشاکش سے رستگاری کا نام نجات ہے۔

نجات، مکتی یا (Salvation) کا قریب قریب یہی تخیل چھوٹے چھوٹے مذاہب میں بھی ہے۔ اس تخیل کی جزئیات میں اختلاف ہو تو ہو لیکن ان سب میں اصولی طور پر ایک قدر مشترک ہے۔ یعنی عقیدۂ نجات کے لئے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام نجات ہے۔ ہمارے ہاں لفظ نجات کا مفہوم ہی چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اس تصور کا نتیجہ ہے کہ انسان کے جسم کو اس کی روح کا قفس اور دنیا کو انسان کے لئے جیل خانہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہر شخص اس جیل خانے میں چکی پیس رہا ہے اور اپنی اپنی میعادِ قید کے مطابق چکی پیس کر چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہ تو رہا عام مذاہب عالم کا حال۔ لیکن خود مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

(i) نہ تو اواگون (تناسخ) کا عقیدہ ہے۔

(ii) نہ ہر بچے کے پیدائشی گنہگار ہونے کا عقیدہ۔

(iii) نہ مورثین اعلیٰ کے جرائم کی پاداش کا تصور۔ اور

(iv) نہ ہی اہرمن ویزداں کی کشمکش کا عقیدہ۔

لیکن اس کے باوجود زندگی کا مقصود ان کے ہاں بھی نجات ہی ہے۔ جسے دیکھئے نجات کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ مذہبی اوامر کی

پابندی اور نواہی سے احتراز، یہ تمام تقشف و تورع، یہ سب "تقویٰ" و "پرہیزگاری"، یہ تمام گریہ وزاری۔ سب عبادات و مناسک۔ نجات حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

لیکن نجات کس سے؟ عذابِ جہنم سے!

ان کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں ڈالا جائے گا اور اس سزا کی میعاد پوری کرنے کے بعد جنت میں بھیجا جائے گا۔ عذابِ جہنم سے اس چھٹکارے کا نام نجات ہے۔ اس نظریے کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے بڑی بڑی فلسفیانہ توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ جہنم درحقیقت ایک سینی ٹوریم ہے جس میں مریضوں کو بھیجا جائے گا تاکہ وہ صحت حاصل کرلیں۔ جب وہ تندرست و توانا ہوجائیں گے تو انھیں جنت کی طرف منتقل کردیا جائے گا۔ کہیں اسے دھوبی کی بھٹی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جس پر داغدار کپڑوں کو چڑھایا جاتا ہے تاکہ ان کی میل کچیل دور ہوجائے۔ جب وہ صاف ہوجاتے ہیں تو انھیں جنت میں بھیجدیا جاتا ہے۔ ان تشبیہات کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم نے ایسے مسلم الثبوت حقائق پیش کردیئے ہیں جن کے زیر نظر دنیا کا ہر انسان، قرآنی تعلیم کے ارفع و اعلیٰ ہونے پر فوراً ایمان لے آئے گا۔ لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ یہ سارا تصور دوسرے مذاہب سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن سے اسے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

پہلے یہ دیکھئے کہ اس تصور کی رو سے آخر الامر ثابت کیا ہوتا ہے؟ آپ صبح دس بجے تندرست و توانا ہیں۔ اس کے بعد آپ کا درجۂ حرارت اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ اسے بیماری (بخار) کی حالت کہتے ہیں۔ آپ اس کا علاج کرتے ہیں۔ شام کو بخار اتر جاتا ہے اور آپ کا درجۂ حرارت پھر اعتدال پر آجاتا ہے۔ یعنی آپ شام کے وقت پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے جو صبح کے وقت تھی۔

یا۔ آپ کا وزن دو من ہے۔ آپ کی طاقت ایک خاص اندازے کی ہے۔ آپ دو ماہ تک بیمار رہے اس سے آپ کا وزن ڈیڑھ من رہ گیا اور طاقت بھی بہت کم ہوگئی۔ آپ کسی سینی ٹوریم میں چلے گئے۔ وہاں علاج، خوراک، فضا کی مساعدت سے آپ کا وزن پھر سے دو من ہوگیا اور طاقت بھی اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ یعنی آپ جیسے بیمار ہونے سے پہلے تھے، پھر ویسے ہی ہوگئے۔

آپ کا کپڑا سفید اور صاف تھا۔ استعمال سے میلا ہوگیا۔ دھوبی نے اسے بھٹی چڑھایا۔ میل کٹ گئی۔ داغ چھٹ گئے۔ یعنی کپڑا پھر اپنی پہلی حالت پر آگیا۔

ان مثالوں کے بعد مسلمانوں کے عقیدۂ نجات کو دیکھئے۔ انسان دنیا میں آنے سے پہلے ایک حالت میں تھا۔ دنیا میں آکر اس نے کچھ برے کام کئے۔ ان برے کاموں کی سزا بھگتنے کے لئے اسے دوزخ میں بھیجدیا گیا۔ وہاں اس کی میل کچیل کٹ گئی۔ داغ دھل گئے۔ یہ پھر اسی حالت پر آگیا جس میں اپنی پیدائش سے پہلے تھا۔

آپ سوچئے کہ اس تخیل میں اور ہندوؤں کے اُس تخیل میں جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، اصولی طور پر فرق کیا ہے؟ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ روح، اپنی اصل سے الگ ہوکر مادہ سے ملوث ہوگئی جس کی وجہ سے اس میں کثافت آگئی۔ اب اسے مختلف بھٹیوں میں سے گذارا جارہا ہے تاکہ اس کی کثافتیں دور ہوجائیں۔ جب یہ اس طرح پاک و صاف ہوجائے گی تو پھر اسی حالت پر آجائے گی جس حالت پر

پہلے تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور اور مسلمانوں کے ہاں نجات کا تصور کس طرح اصولاً ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی دنیا کو جیل خانہ کہا جاتا ہے۔ اس سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی (یعنی دنیاداری) سے پرہیز ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ (حتیٰ کہ متقی کے معنی ہی پرہیزگار کے کئے جاتے ہیں)۔ ہر منبر سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ دنیا مردار ہے اور اس کی طرف لپکنے والا کتا۔ اگر تم دنیاوی آلائشوں میں پھنس گئے تو خدا سے دور ہوتے جاؤ گے۔ قربِ خداوندی کے لئے دنیا سے دور رہنا نہایت ضروری ہے۔ نجات حاصل کرنے کے لئے خواہشات کا ترک کرنا لازمی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تمام عقائد وہی ہیں جو ہندوؤں کے ہاں نجات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں کے تصوف میں وحدتِ وجود کا عقیدہ تو لفظاً لفظاً وہی ہے جو ویدانت کی اصل ہے۔ یعنی انسانی روح، روحِ خداوندی کا جزو ہے۔ اب یہ جزو اپنے کل سے ملنے کے لئے بیتاب ہے۔ روح کو دنیا کی خاردار جھاڑیوں سے چھڑانے کے لئے، مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی ضرورت ہے۔ جب اس قسم کے زہد اور تورع سے روح کی آلائشیں صاف ہو جائیں گی تو جزو اپنے کل سے جا ملے گا۔ اسی لئے ان کے ہاں وفات کے بجائے وصال کہا جاتا ہے (یعنی فلاں بزرگ کا وصال ہو گیا) اور مرنے والے کو واصل بالحق کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی وہ جو خدا سے مل گیا۔ جزو اپنے کُل میں مدغم ہو گیا۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

لہٰذا ہمارے ہاں، شریعت اور طریقت دونوں میں نجات کا تصور، دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس تصور کو قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس تصور کی رو سے، انسان کی تخلیق، اس کی زندگی کی تمام تگ و تاز اس تمام پروگرام کا نتیجہ جسے قرآن نے اس شرح و بسط اور تاکید و تہدید کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یکسر بے نتیجہ اور باطل بن کر رہ جاتا ہے۔ روح، جسم میں آنے سے پہلے کسی حالت میں تھی۔ اسے دنیا میں بھیجا گیا تاکہ وہ مادہ سے ملوث ہو جائے۔ پھر اسے مختلف بھٹیوں میں سے گذارا گیا تاکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آجائے! سوچئے کہ انسانی زندگی کی اس تمام تگ و تاز کا ماحصل کیا ہوا؟ خدا کے اس تمام بکھیڑے پروگرام کا نتیجہ کیا نکلا؟ بس (As you were) غور کیجئے کہ کارگہِ حیات کا اس قدر محیر العقول سلسلہ اور ایسا بے معنی؟ انسانی زندگی کے لئے ایسا پرشکوہ پروگرام اور اس قدر بے نتیجہ؟ اور یہ سب کچھ منسوب کیا جائے اُس خدائے حکیم کی طرف جو چھت پر کھڑے ہو کر نہیں، آسمان سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہم نے اس کائنات کو باطل (منفیانہ Negative انداز سے) پیدا نہیں کیا، اسے بالحق (مثبت نتائج کا حامل بنا کر) پیدا کیا ہے۔ ہم کھیل نہیں رہے کہ مٹی کا گھروندا بنایا اور جب کھیل ختم ہوا تو اُسے پاؤں سے مسمار کر دیا اور اس طرح مٹی پھر اپنی پہلی حالت میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوؤں نے نجات کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کی رو سے خدا کا تصور اسی قسم کا پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ یہ تمام کائنات "ایشور کی لیلا" ہے۔ (یعنی خدا نے یہ کائنات، تھیٹر کے کھیل کے طریق پر بنائی ہے)۔ اسی اعتبار سے ان کے ہاں خدا کو نٹ راجن (کھلاڑیوں کا راجہ) کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کہدیا کہ ہم نے سلسلۂ کائنات کو لاعبین (کھیل کے طور پر) نہیں بنایا۔ لہٰذا کوئی ایسا پروگرام جس میں سب کچھ ہو چکنے کے بعد کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو خدائے حکیم کے شایانِ شان نہیں۔

لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

اس لئے نجات کا وہ تصور جس کی رو سے یہ سمجھا جائے کہ انسان جس مصیبت میں پھنسا ہے اس سے چھوٹ جائے اور مثبت نتیجہ کچھ نہ نکلے، قرآنی تصور نہیں ہو سکتا۔

اصل مقصود تک آنے سے پہلے، یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ قرآن میں لفظ نجات کس انداز سے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں سطحِ مرتفع (بلند جگہ) جہاں انسان سیلاب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بنیادی معنی محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ، دنیاوی غم و آلام، دشمنوں کے مکائد و حیل، سرکش و متمرد قوتوں کے جور و استبداد اور دیگر اسی قسم کی صعوبات و مشکلات سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے فرعون کے مظالم سے رہائی پانے کا ذکر نجینا اور انجینا جیسے الفاظ میں ہوا ہے۔ حضرت یونسؑ کو غم و آلام سے رہائی ملنے کے لئے بھی ونجینہ من الغم (۲۱/۸۸) کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن دوسرے مقامات پر، غم و آلام اور مصائب و مشکلات سے (مخلصی حاصل کرنا نہیں بلکہ ان سے یکسر) محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی نجات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت ہود۔ صالح۔ شعیب علیہم السلام کا ان کی اقوام کی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رکھنے کا ذکر انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ (انجینٰھم من عذاب غلیظ (۱۱/۵۸، ۶۶، ۹۴)۔ حضرت ابراہیمؑ کے آتشِ نمرود سے محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے (فانجٰہ اللہ من النار ۲۹/۲۴) حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو بربادیوں کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی نجات ہی کا لفظ آیا ہے (۲۹/۳۲) دیگر انبیاء کرام اور جماعت مومنین کو مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ (دیکھئے ۱۰/۱۰۳) لیکن یہ مقامات وہ ہیں جہاں اس دنیا کے نامساعد حالات سے رستگاری حاصل کرنے یا ان سے محفوظ رکھے جانے کیلئے لفظ نجات کا استعمال ہوا ہے۔ حیاتِ اُخروی میں، جہنم میں ڈال کر پھر وہاں سے نکالنے کیلئے یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ اُس سے محفوظ رکھے جانے کے لئے مومنین کو یہ دعائیں سکھائی گئیں کہ فقنا عذاب النار (۳/۱۹۱) "ہمیں عذابِ نار سے محفوظ رکھیو" یہ حفاظت اس انداز سے ہوگی کہ اولئک عنھا مبعدون (مومنین کو جہنم سے دور رکھا جائے گا۔) لا یسمعون حسیسھا (۲۱/۱۰۱) وہ اس سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ اس کی بھنک تک بھی ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

لہٰذا قرآن میں، جہنم میں پڑ کر پھر وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذکر کہیں نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے کہیں نجات کا لفظ آیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

قرآن نے حیات کے متعلق ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے اس نے کہا کہ حیات کی حرکت دَوری (Cyclic) نہیں، ارتقائی ہے۔ زندگی نہ پیچھے مڑتی ہے نہ بار بار اعادہ کرتی ہے۔ . . . . . یہ تصور باطل ہے کہ زندگی ایک نقطہ سے چل کر اور اتنے منازل طے کرنے کے بعد پھر اسی نقطہ پر واپس آجاتی ہے۔ حیات، صراطِ مستقیم پر چل رہی ہے۔ یعنی وہ توازن بردوش

قوتوں کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک ہی مقام پر گردش نہیں کر رہی۔ اس نے کہا کہ کائنات کے ذرے ذرے میں حیات اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے۔ جو نوع (Species) اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو اصلح ثابت کردے (یعنی اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا کرلے) وہ سلسلۂ ارتقا کی ایک اور منزل طے کر کے ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ جو اس قسم کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی وہ وہیں رک جاتی ہے۔ لہذا زندگی میں رجعت وتکرار نہیں، عروج وارتقا ہے۔ خاک کے ذرات اسی قانونِ ارتقا کے مطابق، مختلف منازل طے کرتے کرتے انسان کی سطح تک آگئے۔ سلسلۂ ارتقا کی اس نئی (اور نہایت اہم) کڑی، یعنی انسانیت میں ایک نئے جوہر کا اضافہ ہوا۔ یعنی اسے شعور وادراک اور اختیار وارادے سے نوازا گیا۔ یہی وہ امتیاز ہے جس سے انسان موجوداتِ عالم میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے۔ انسان کا بچہ، اس جوہر کو ساتھ لیکر، کارزارِ عالم میں قدم رکھتا ہے جس کی پوری وسعتیں اس کے سامنے ہیں۔ اسے راستے کے نشیب وفراز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر دوراہے پر نشانات کے کھمبے (Sign Posts) نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ منزل کا نشان بتا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اب تمہیں اپنی سعی وعمل سے اس اگلی منزل تک پہنچنا ہے۔ جو وہاں تک پہنچ جاتا ہے وہ کامیاب ہے جو نہیں پہنچتا وہ خاسر وناکام ہے۔ غور فرمائیے! قرآن نے ان کڑیوں کو کس قدر دلکش اور جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۂ الدھر میں ہے:۔

هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئاً مذكورا - (۷۶/۱)

انسان پر یقیناً وہ زمانہ بھی گزرا ہے، جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی تگ وتاز سے مقصود یہ ہے کہ انسان جس پہلی حالت میں تھا پھر وہیں پہنچ جائے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) تو قرآن کی رو سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قابلِ ذکر انسان کے درجے سے پھر ناقابلِ ذکر شے کے درجے میں پہنچ جائے! کس قدر بے معنی ہے یہ مقصد؟

اس کے بعد فرمایا:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (۷۶/۲)

ہم نے انسانی تخلیق کی ابتدا مخلوط نطفے سے کی۔ پھر اسے گردشیں دیتے ہوئے اس حالت تک لے آئے کہ سننے اور دیکھنے والا انسان بن گیا۔

مخلوط نطفے سے تخلیق، درجۂ حیوانیت ہے۔ لیکن انسان کو سماعت وبصارت (اور دوسرے مقام پر ہے، فؤاد - Mind) عطا کئے جو ذرائع علم ہیں۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ اسے راستے کے پیچ وخم سے آگاہ کر دیا۔ انا ھدینہ السبیل (۷۶/۳)۔ اب یہ اس کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ راہ اختیار کرے جو اس کی صلاحیتوں کو ابھار کر بار آور کردے یا وہ راہ جو انہیں دبا کر برباد کردے (اما شاکرا و اما کفورا ۷۶/۳) اس کے بعد کی آیات میں ہے کہ صحیح راہ پر چلنے والوں کی منزل جنت ہے اور غلط راہ پر جانے والوں کا مقام جہنم۔ یعنی انسان جب دنیا میں آتا ہے تو وہی قانونِ ارتقاء جو اس سے پہلے کی کڑیوں میں جاری وساری تھا اس پر منطبق ہوتا ہے۔ مغرب کے میکانکی تصورِ حیات کی رو سے، انسان اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کو طبعی تبدیلیوں سے زیادہ کچھ

نہیں مانتے۔ لیکن قرآن اس مقام سے آگے بڑھتا ہے، اور کہتا ہے کہ علم وعقل کے یہ مدعی کس دھوکے میں پڑ گئے! زندگی کا ارتقائی سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ حقیقی ارتقاء تو اب شروع ہوا ہے۔ یہ منزل تو شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ کی اولیں منزل ہے۔ یہ تو انسانیت کا گہوارہ ہے۔ اسے ابھی اور بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔

یکے در معنیٔ آدم نگر! از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

خاک کے ذروں کا معراجِ کمال بیشک یہی تھا کہ وہ پیکرِ انسانی میں متشکل ہو جائیں لیکن معراجِ انسانیت کے لئے تو ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسان نے اس حیاتِ ارضی سے بلند و بالا، اس ہیولیٰ مادی سے نفیس و لطیف اور اس محبسِ عناصر سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے۔ وہ اعمالِ حیات جو اس کے اندر اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر دیں، اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں۔ یہ صلاحیت جس سے انسان اس زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے، بہت بڑی کامیابی اور قابلِ قدر کامرانی ہے۔ اس کے لئے قرآن نے فلاح اور فوز کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ فلاح کے معنی کھیتی کا بار آور ہونا ہے اور فوز کہتے ہیں . . . . . (Achievement) کو۔ اصحٰب الجنۃ ھم الفائزون (۵۹/۲۰)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کی رُو سے زندگی کی حرکت دَوری نہیں، بلکہ حیات، صراطِ مستقیم پر جا رہی ہے۔ وہی صراطِ مستقیم جو زندگی کو نشوونما دینے والے خدا کی راہ ہے (ان ربی علیٰ صراطٍ مستقیم)۔ یہ راہ صرف آگے لے جانے والی ہی نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے۔ کیونکہ جس خدا کی یہ راہ ہے وہ ذوالمعارج (سیڑھیوں والا) بھی ہے۔ وہ انہی سیڑھیوں (ارتقائی منازل) کی رو سے انسان کو درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ لترکبن طبقاً عن طبق۔ (۸۴/۱۹) "تم یقیناً طبقاً عن طبقٍ بلند ہوتے چلے جا رہے ہو" یعنی زندگی، کنارِ خاک میں جوئے آب کی روانی نہیں بلکہ اپنے زورِ دروں سے فوارہ کی طرح بلندیوں کی طرف جانے والی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے، زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا (نجات) نہیں بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سے بلند مقامات کا حصول (Attainment) ہے۔ یعنی تخمِ حیات کی آبیاری اور پرورش سے اسے ایک . . . تنومند و توانا، شجرِ طیب میں تبدیل کر دینا۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! قد افلح من زکّٰھا۔ جس نے تخمِ حیات کو نشوونما دیا اسی کی کھیتی بار آور ہوئی۔ وقد خاب من دسّٰھا۔ جس نے اس بیج کو مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا، اس کی کھیتی کا ثمر بار ہونا تو ایک طرف، خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔

اب یہ دیکھئے کہ جسے اعمال کی سزا کہا جاتا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔ سزا تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ اول انتقامی۔ مثلاً آپ کو

کسی نے گالی دی۔ آپ نے غصے میں آکر اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔ اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ آپ نے انتقام لے لیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو مل نہیں سکتی۔ وہ ذاتِ صمدیت غصہ کے انتقامی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ ہم اگر گناہ کرتے ہیں تو تو اس کا کیا بگڑتا ہے جو اسے غصہ آجائے اور اس کے انتقام میں ہمیں سزا دے۔ انتقام، نقم سے ہے جس کے معنی راستے کا درمیانی حصہ ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات ایسا غالب اور زبردست ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے راستے سے اِدھر اُدھر ہو جائے۔ لہٰذا جب انتقام کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی، جیسا کہ قرآن کی بعض آیات میں اُسے "ذوانتقام اور منتقم" کہا گیا ہے، تو اس سے یہی مفہوم ہوگا۔ چنانچہ سورۂ زمر میں اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے، جہاں فرمایا کہ ومن یضلل اللہ فما لہٗ من ھاد۔ جو شخص خدا کے قانون کی سیدھی راہ کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کرلے تو ان میں سے کوئی راہ اسے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ ومن یھد اللہ فما لہٗ من مضل۔ اور جو قانونِ خداوندی کی راہ پر جا رہا ہو اُسے دوسری غلط راہیں بے راہ نہیں کر سکتیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ الیس اللہ بعزیز ذی انتقام (۳۹/۳۶) کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے، جو کسی کو اپنے قانون کی گرفت سے ادھر ادھر نہیں جانے دیتا۔

سزا کی دوسری قسم تادیبی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص نے چوری کی، حکومت نے اسے جیل خانے بھیج دیا تاکہ قید و بند کی صعوبات سے اُسے سبق مل جائے کہ جرم کے یہ عواقب ایسے ہوتے ہیں اور اس طرح وہ خود بھی، اور دوسرے دیکھنے سننے والے بھی، آئندہ ارتکابِ جرم سے مجتنب رہیں۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ اخروی میں اس قسم کی سزا بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہاں جرم سے اجتناب کے معنی ہی کچھ نہیں، نہ ہی عبرت پکڑنے سے کچھ حاصل! قرآن میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہاں اہلِ جہنم چلائیں گے، گڑگڑائیں گے کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے۔ پھر دیکھئے کہ ہم کس طرح جرائم سے اجتناب کرتے ہیں۔ لیکن جواب ملے گا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ زندگی پیچھے نہیں مڑ سکتی۔ اس میں رجعت و تکرار نہیں۔ جو ہو چکا، سو ہو چکا۔ سلسلۂ ارتقا یا تو آگے بڑھ جاتا ہے یا رک جاتا۔ لہٰذا سزا کی یہ دوسری شکل بھی درست نہیں۔

سزا کی تیسری صورت، اعمال کا فطری نتیجہ ہے .. (Natural Consequences of actions) آگ میں ہاتھ ڈالئے۔ اس کا فطری نتیجہ جل جانا ہوگا۔ زہر کھائیے، اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہوگا۔ اس لئے اعمال کی جزا و سزا ان کے فطری نتائج کی ترتیب کا ظہور ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ عمل کو نتیجہ تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ وقت اتنا کم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عمل اور اس کا نتیجہ بیک وقت (Simultaneously) مرتب ہو گیا۔ لیکن بعض کام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے نتائج مرتب ہونے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ قرآن میں اس قانونی تدریج و امہال (درجہ بدرجہ، پورے وقت کے بعد نتیجہ تک پہنچانے کے قانون) کے متعلق متعدد مقامات پر شرح و بسط سے تصریحات موجود ہیں۔ اس تمام عرصہ میں نتیجہ زیرِ ترتیب ہوتا ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو وہی نتیجہ مشہود و محسوس طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اسے یوم الجزا، یا یوم الدین کہا جاتا ہے۔ یعنی ظہورِ نتائج کا زمانہ۔ سورۃ النحل میں ہے:-

ولو یواخذ اللہ الناس بظلمہم ما ترک علیہا من دابۃ ولکن یوخرھم الیٰ اجل مسمی۔ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون (۱۶/۶۱)

اور اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا تو ممکن نہ تھا کہ زمین کی سطح پر کوئی چلنے والا باقی رہتا۔ لیکن وہ انھیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ظہور نتائج کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک ثانیہ آگے۔

پانی کو آگ پر رکھئے وہ غیر محسوس طور پر بتدریج حرارت جذب کئے جائے گا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ اس نقطہ تک پہنچ جائے گا جہاں وہ کھولنے لگے گا۔ اب اس کے اشتعال و اضطراب کو ہر آنکھ دیکھ لے گی۔ اپنے مرض کے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ لیجئے وہ کہدیگا کہ آپ بیشک درست کہتے ہیں کہ میں رات کو اچھا بھلا سویا۔ صبح اٹھا تو جوڑوں میں درد ہو رہا تھا لیکن اس مرض کی ابتدا تو چھ ماہ قبل ہو گئی تھی۔ آپ کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ شکایت درد کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ فطرت کے قانونِ ارتقاء میں اس آئینِ تدریج و تاجیل (رفتہ رفتہ، وقتِ معین پر نتیجہ کے ظاہر ہونے کے قانون) کو بڑا دخل حاصل ہے۔ سطح بین نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا۔ لیکن جو نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقیقت کو بے نقاب دیکھتی ہیں انھیں صاف صاف نظر آجاتا ہے کہ اس بظاہر سکون و سکوت کے نیچے کتنی قیامتیں کروٹ بدل رہی ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبعی دنیا (Physical World) میں ہر عمل ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے، اسی طرح معنوی دنیا میں بھی ہر عمل ایک نتیجہ تک منجر ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نتائج انسان کی اسی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں لیکن اگر قانونِ تربص و امہال کے مطابق، ظہور نتائج کا وقت اس زندگی میں نہیں آتا، تو یہ نتائج اس کے بعد کی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ حیات، مسلسل حرکت کا نام ہے اور اس میں کہیں انقطاع نہیں۔ اس لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کسی عمل کا نتیجہ یہیں برآمد ہو گیا یا سلسلۂ تنفس کے ختم ہو جانے کے بعد برآمد ہوا۔ انسان کا جسم اس کے اعمال (Actions) کا محض ذریعہ یا واسطہ (Instrument) ہوتا ہے۔ اعمال کا اصل محرک کچھ "اور" ہوتا ہے۔ جب جسم موت کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے تو "کچھ اور" بدستور باقی رہتا ہے۔ لہذا اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ظہورِ نتائج جسم کی موجودگی میں ہوا ہے یا اس کے بعد۔ ترتیب نتائج اسی وقت شروع ہو جاتی ہے۔ محض ظہور نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ "یوم الدین" یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق ترتیب و ظہور نتائج کا زمانہ اس وقت بھی موجود ہے۔ وما ھم عنھا بغائبین (۸۲/۱۶) یہ تو کلی قیامت ہے جس کا اس زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ اسی کو مخاطب کر کے اقبال نے کہا ہے کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی　　　ہزار حیف ندیدی قیامتِ موجود

یہی وہ قیامتِ موجود ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وما ھم عنھا بغائبین۔ وہ کہیں ڈھکی چھپی نہیں۔ اس وقت بھی موجود ہے۔ ترتیب نتائج تو بہر حال اعمال کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کے نتائج کا ظہور بھی اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (۱۶/۹۷)

جس کسی نے ہمواریاں پیدا کرنے والے (یا صلاحیت وصالحیت پیدا کرنے والے) کام کئے۔ خواہ مرد ہو خواہ عورت۔ اور ان اعمال کی بنیاد مستقل اقدار کے یقین پر رکھی۔ تو اسے ہم ضرور اس دنیا میں خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور ان کے اعمال کی نسبت سے نتائج مرتب ہوں گے۔

خوشگوار زندگی کا یہ سلسلہ یہاں سے شروع ہوگا اور مسلسل آگے تک چلا جائے گا۔

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ۔ ولدار الاخرۃ خیر۔ ولنعم دار المتقین۔ (۱۶/۳۰)

جو لوگ انسانی معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے کام کرتے ہیں ان کی دنیاوی زندگی میں حسین توازن قائم رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی آئندہ زندگی میں بھی ان کی اختیاری قوتوں میں وسعت آجاتی ہے۔ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی کرنے والوں کے لئے وہ کاشانۂ حیات نہایت خوشگوار ہے۔

اس کے برعکس، غیر صالح (ناہمواریاں پیدا کرنے والے اعمال) کے متعلق فرمایا کہ ان کا نتیجہ اس دنیا میں ذلت ورسوائی ہے (لہٗ فی الدنیا خزیٌ) اور اس کے ساتھ ہی آئندہ زندگی کی تباہی اور خرابی بھی (ونذیقہ یوم القیمۃ عذاب الحریق۔ ۲۲/۹)

انسان کی نگاہیں چونکہ اسی زندگی کی چار دیواری میں گھری ہوئی ہیں اس لئے وہ مکافاتِ عمل کو بھی اسی چار دیواری میں محدود سمجھتا ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) عمل اور اس کے ظہورِ نتائج کے درمیانی وقفہ کے لئے دنیاوی چار دیواری کچھ حقیقت نہیں رکھتی اس کا تعلق حیات سے ہے جو مسلسل آگے بڑھ جاتی ہے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اس نے کائنات کو پیدا ہی اس انداز سے کیا ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے۔

خلق اللہ السمٰوٰت والارض بالحق۔ ولتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون (۴۵/۲۲)

اللہ نے سلسلۂ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ یعنی اس لئے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال (کمائی) کا بدلہ دیا جائے۔ اور اس طرح کسی کے معاملے میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔

اس دنیا پر نگاہ ڈالئے۔ یہاں ہر شے قوانین طبعی کے حدود سے گھری ہوئی ہے اس لئے یہاں اعمال کے نتائج برآمد ہونے کے لئے مادی اسباب اور طبعی ذرائع کی ضرورت ہے۔ یہ قانون خود خالقِ کائنات کا متعین فرمودہ ہے، اس لئے اس کا منشاء (مشیت) یہی ہے کہ یہاں ہر کام قانونِ طبعی کے مطابق نتیجہ خیز ہو۔ مثلاً حق میں بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کو موثر بنانے یا بروئے کار لانے کیلئے شمشیر خاراشگاف کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حق کو برقرار رکھنے اور غالب کرنے کے لئے قوت موجود نہیں تو حق غالب نہیں آسکے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہدیا کہ ہم نے نظامِ آئین وعدل کے بقاء اور استحکام کے لئے حدید (فولاد) کو بھی نازل کیا ہے۔ (دیکھئے سورۂ حدید) اس نے حق کی حمایت کرنے والی جماعت سے برملا کہدیا کہ حق کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اعدوا لھم ما استطعتم

من قوۃ (۸/۶۰) مخالفین کے مقابلے کے لئے قوت فراہم کرو۔ اس لئے کہ مادیت کی چار دیواری میں گھری ہوئی دنیا میں اعمال کے نتائج مادی ذرائع کی رو سے، مادی پیکروں میں ہی نمودار ہوں گے۔ اس حد تک مومن اور کافر دونوں برابر ہیں۔ ایک مادہ پرست قوم اگر قوت فراہم کرلے گی تو اس کے ہاتھ میں بھی سلطنت و حکومت اسی طرح آجائے گی جس طرح ایک "خدا پرست" قوم کے ہاتھ میں۔ لیکن اس کے بعد ان دونوں میں فرق شروع ہو جائے گا۔ وہ قوم جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے گی وہ قوت و حکومت کو، انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے استعمال کریگی۔ اس کے برعکس، حکومت و سلطنت کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھنے والی قوم، اس حکومت کو نظامِ ربوبیت کے قیام کا ذریعہ بنائے گی تاکہ جوہرِ انسانیت کی نشوونما کا انتظام ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کے ان اعمال کے بھی تو نتائج مرتب ہوں گے۔ ان میں سے جن اعمال کے نتائج یہیں مرتب ہو جائیں گے ان کا ظہور مادی پیکروں میں ہو گا۔ جن کا ظہور ذرا آگے چل کر ہو گا وہ وہاں کے آئین و ضوابط کے مطابق متشکل ہوں گے۔ وہاں معنوی نتائج بھی محسوس طور پر سامنے آجائیں گے کیونکہ وہاں کا قانون یہ ہے کہ فکشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد (۵۰/۲۲) وہاں آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور نگاہیں بجلیاں بن جائیں گی جس سے مستور حقائق بھی بارز طور پر سامنے آجائیں گے۔ (وبرزت الجحيم لمن يرى)

اب کائنات کے آئینِ ارتقاء پر غور کیجئے۔ کائنات میں تخریبی اور تعمیری دونوں قوتیں کارفرما ہیں۔ تعمیری قوتیں اشیائے متعلقہ کے نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن تخریبی قوتیں ان کے ضعف و انتشار میں کوشاں رہتی ہیں۔ اگر تعمیری قوتیں غالب رہیں تو نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غلبہ پا جائیں تو نشوونما رک جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اضمحلال و پژمردگی شروع ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم میں اس تعمیری قوت کا نام توانائی (Vitality) ہے۔ اور تخریبی قوتیں بالعموم وہ مختلف جراثیم ہیں جو تعدیہ (Infections) سے پیدا ہوں یا غلط غذا کے کیمیائی عمل سے۔ بعض اوقات یہ جراثیم وبائی صورت میں یورش کر کے آجاتے ہیں۔ یہ جراثیم فضا میں پھیلے رہتے ہیں اور ہر جسم پر حملہ کرتے ہیں۔ جس شخص کی توانائی زیادہ ہو، جراثیم اپنا اثر نہیں کر سکتے۔ یا یوں کہئے کہ وہ توانائی ان کے تخریبی اثرات کی مدافعت کر دیتی ہے۔ جہاں توانائی کم ہو جاتی ہے جراثیم غلبہ پا جاتے ہیں۔ اسی کا نام ابتدا میں بیماری اور اس کے بعد (ان کے مسلسل غلبہ کے انجام کا نام) موت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی قانونِ ارتقا جوہرِ انسانیت کے نشوونما میں کارفرما ہے۔ انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یعنی اس کی ذات پر ایک اثر مرتب کر دیتا ہے۔ یہ وہ "اعمالنامہ" ہے جو ہر شخص کی گردن میں حمائل رہتا ہے۔ اس پر اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ خود اس کی اپنی ذات شاہد ہے۔ یہ اثرات، یا تو توانائی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں یا تخریب کا موجب۔ یعنی انسانی اعمال یا ایجابی (Positive) اثر مرتب کرتے ہیں یا سلبی (Negative)۔ یا بقول اقبال، وہ انسانی ذات (خودی) کے استحکام، استبقاء کا موجب ہوتے ہیں یا اس کے اضمحلال و تخریب کا باعث۔ لیکن سلبی ہوں یا ایجابی، بلا نتیجہ کوئی عمل نہیں رہتا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ - ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ - (۹۹/۸)

جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی ایجابی عمل کرے گا اس کا نتیجہ سامنے آئے گا اور جو ایک ذرے کے برابر تخریبی عمل کرے گا اس کا بھی نتیجہ مرتب ہو کر رہیگا۔

یہ عملِ تعمیر و تخریب جاری رہتا ہے۔ یہ کشمکشِ "خیر و شر" ہر آن موجود ہوتی ہے۔ ان نتائج کا قانونِ ارتقاء کی میزان میں وزن ہوتا رہتا ہے اگر تعمیری نتائج کے اعمال کا پلڑا بھاری ہو تو انسان کی نشوونما جاری رہتی ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہو جائے تو نشوو ارتقاء کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون۔ جس کی تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہا، اس کی کھیتی بارآور ہو گئی۔ ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم۔ اور جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو گیا تو اس کی ذات (نفس) کا استحکام ٹوٹ گیا۔ انسانی خودی کی (Disintegration) ہو گئی اس حالت کا نام جہنم ہے۔ فی جھنم خالدین (۲۱/۱۰۰) یہی ہیں جہنم میں رہنے والے۔

یہ ظاہر ہے کہ جس کی تعمیری قوتوں (توانائی) کا پلڑا بھاری ہوتا ہے اس میں تخریبی قوتیں یکسر معدوم نہیں ہوتیں۔ وہ قوتیں موجود ہوتی ہیں لیکن تعمیری قوتیں ان کے عملِ تخریب کو غالب نہیں آنے دیتیں اور اس طرح ان کا تخریبی اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اس عمل کا نام قرآن کی اصطلاح میں مغفرت ہے۔ مغفرت کے معنی ہی مدافعت ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیأت (۱۱/۱۱۴) توازن قائم رکھنے والے اعمال، توازن بگاڑنے والے اعمال کے تخریبی اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے:-

ومن یؤمن باللہ ویعمل صالحا یکفر عنہ سیأتہ ویدخلہ جنت . . . . ذالک الفوز العظیم۔ (۶۴/۹)

جو اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے ہماری پیدا کرنے والے کام کئے تو اللہ کا قانون ان کے توازن بگاڑنے والے اعمال کے اثرات کو زائل کر دے گا اور ان کی صلاحیتوں کی بنا پر انھیں "جنات" میں داخل کریگا..... یہ بہت بڑی (Achievement) ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ خدا کا قانون تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر کے ان کی حالت کو صلاحیتوں سے ہم آغوش بنا دیگا (اصلح بالھم ۴۷/۲) جو طالب علم امتحان میں ساٹھ فیصدی نمبر حاصل کرلے اسے اگلی کلاس میں جانے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کی چالیس فیصدی غلطیاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں (Pass - Marks) کی یہ (Percentage) اس قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے جسے قانونِ مشیت کہا جاتا ہے۔ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن ساٹھ فیصدی نمبر حاصل کرنے والے کے لئے لازمی مضامین (Compulsory Subjects) میں پاس ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیأتکم وندخلکم مدخلا کریما (۴/۳۱) اگر تم ان بڑی بڑی (اصولی) باتوں سے محتنب رہو جن سے تمہیں روکا گیا ہے (اور جو تمہاری تخریبِ ذات کا موجب ہیں) تو ہم کم درجہ کی تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر دیں گے اور تم اس طرح سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی میں جا پہنچو گے جو نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ (نیز دیکھئے ۵۳/۳۲)

یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعمیری قوتیں غالب رہتی ہیں اس لئے ان کی نشوونما کا سلسلہ برقرار رہتا ہے اور وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی

منزل میں جا پہنچتے ہیں۔ اس نشوونما یافتہ حالت کا نام جنت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس جن پر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں۔ جہنم کا لفظ عربی الاصل نہیں۔ غالباً عبرانی ہے۔ لیکن قرآن نے اس کے لئے دوسرا لفظ جحیم استعمال کیا ہے۔ اجحم عنہ کے معنی ہیں، وہ اس سے رک گیا۔ جو نوع سلسلۂ ارتقا میں رک جاتی ہے وہ ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے اور وہیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہنم کا لفظ ہر جگہ واحد کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ اسلئے کہ رکنے والوں کا ایک ہی مقام ہوتا ہے۔ مختلف مقامات کے درجے تو آگے بڑھنے والوں کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے جنت کے لئے واحد (جنت) تثنیہ (جنتان) اور جمع (جنات) کے صیغے آئے ہیں۔ اہل جنت کے متعلق یہ تصریح بھی موجود ہے کہ وہ صراط حمید پر چلنے کی دعائیں مانگیں گے اور ان کی پیشانی کا نور ان کے آگے آگے چلے گا۔ یعنی جنت، رکنے کا مقام نہیں آگے بڑھنے کا مقام ہے۔

نشوونما پانے والے تو آگے بڑھتے ہیں لیکن سلسلۂ ارتقا میں کسی ایک مقام پر رک جانے والے ہمیشہ وہیں رہتے ہیں۔ جن کی نشوونما رک جاتی ہے ان کے لئے اس مقام سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اسی لئے فرمایا کہ یریدون ان یخرجوا من النار وما ھم بخارجین منھا ولھم عذاب مقیم (۵/۳۷) وہ بہتیرا چاہیں گے کہ جہنم سے نکل سکیں وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ وہ اسی ایک حالت میں رُکے رہیں گے۔ خالدین فیھا ابدا (۴/۱۲۲) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ خود لفظ عذاب اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ اعذاب کے معنی ہیں روک دینا۔ عاذب اس اونٹ کو کہتے ہیں جو شدت پیاس کی وجہ سے کھانا بند کر دے اور اس سے اس قدر لاغر ہو جائے کہ نہ اس سے چلا ہی جائے اور نہ ہی پھر کھانے پینے کی ہمت باقی رہے۔ یعنی جو زندگی کی شیرینی[1] سے اس درجہ محروم ہو جائے کہ اس میں پھر زندگی کی شیرینیوں سے متمتع ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

غور کیجئے! جس طرح نشوونما پاکر آگے بڑھنے والے کی تعمیری قوتوں کے ساتھ، تخریبی اعمال کے اثرات بھی موجود تھے لیکن چونکہ اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ تھا اس لئے تخریبی قوتوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اسی طرح جب تخریبی قوتوں کا غلبہ ہو گیا تو پھر تعمیری قوتیں بیکار ہو کر رہ گئیں۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جب نیکیاں زیادہ ہو گئیں تو انسان سیدھا جنت میں چلا گیا۔ یہ نہیں کہ پہلے برائیوں کی "سزا" بھگتنے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے اور پھر قید کی میعاد پوری کرنے کے بعد، جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یا اگر برائیوں کی زیادتی ہو گئی تو ایک مدتِ مدید تک جہنم میں رکھکر پھر نیکیوں کی جزا کے لئے جنت میں بھیجا جائے۔ یہ تصور قرآنی نہیں ہے۔ نجات کا غیر قرآنی تصور ہے۔ چنانچہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بالتصریح فرما دیا کہ جن کا پلڑا بھاری ہو گا وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے اور جن کا پلڑا ہلکا ہو گا وہ سیدھے جہنم میں۔ نہ ان کی کمزوریاں انھیں عذاب جہنم کی طرف لے جائینگی نہ ان کی نیکیاں انھیں عذاب بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کریں گی۔ اسی لئے فرمایا کہ

بلیٰ۔ من کسب سیئۃ واحاطت بہ خطیئتہ، فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون (۲/۸۱)

---

[1] عذب کے معنی شیریں یا میٹھے پانی کے بھی ہیں۔
ثواب کے مفہوم کے لئے دیکھئے الگ مقالہ جو اسی پرچہ میں شائع ہو رہا ہے۔

یاد رکھو! قانونِ خداوندی یہ ہے کہ جس نے توازن بگاڑنے والے کام اس حد تک کئے کہ اس کی کمزوریوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ تو یہ لوگ سیدھے جہنم میں جائیں گے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ وہ ہیں کہ جن کے لئے میزان قائم کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی (لا نقیم لہم یوم القیامۃ وزنا)۔ اس لئے کہ لا خلاق لہم فی الآخرۃ (۳/۷۷) ان کا حیاتِ اخروی میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اولئک حبطت اعمالہم۔ ان کے تعمیری قوتوں والے اعمال سب رائیگاں چلے گئے۔ حبط کے لفظ پر غور کیجئے۔ اگر کوئی مویشی اتنا کھالے کہ بیماری سے اس کا پیٹ پھول جائے اور اس کا جارہ جزوِ بدن نہ بنے بلکہ یونہی (غیر ہضم شدہ) خارج ہو جائے تو اس کیفیت کو حبط سے تعبیر کرتے ہیں۔ حبطت اعمالہم کے معنی ہیں کہ سطحِ بیں نگاہوں کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے اعمال کا وزن ہے لیکن چونکہ تخریبی قوتوں کی زیادتی کی وجہ سے ان میں نشوونما کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اس لئے ان کی تھوڑی سی تعمیری قوتیں بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ غور کیجئے۔ جب انسان مرتا ہے تو اس میں اُسوقت بھی کچھ نہ کچھ توانائی تو باقی ہوتی ہے۔ لیکن وہ توانائی اس کے کسی کام نہیں آتی کیونکہ تخریبی قوتیں اس درجہ غالب آجاتی ہیں کہ وہ نظامِ بدن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ لہٰذا جہنم میں بھیجا ہی اسے جاتا ہے جس میں جنت میں جانے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ مرتا وہی ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت نہیں رہتی۔ آگے بڑھنے سے رُکتا ہی وہی ہے جس میں نشوونما کی استعداد مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ استعداد کبھی تو بتدریج مفقود ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک غلط قدم ان صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ مثلاً خود مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ من قتل مؤمنا متعمدا فجزاءہ جھنم خالدا فیہا (۴/۹۳) جس نے کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یا مثلاً سورۂ انفال میں جنگِ بدر کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ آج کے دن، جو شخص میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا تو ماوٰہ جھنم (۸/۱۶) اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اس قسم کا ایک غلط قدم، نشوونما کی ساری قوتوں کو تباہ کر دیتا ہے جیسے سنکھیا کی ایک پھانکی عمر بھر کی خوراک سے حاصل کردہ قوتوں کو ایک لمحہ میں زائل کر دیتی ہے یا چاقو کی ایک چبھن ساری عمر کے لئے آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ یعنی بعض تخریبی قوت اس قدر تیز اثر ہوتی ہے کہ عمر بھر کی تعمیری قوتیں اس کے سامنے بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض تعمیری قوتیں اس قدر تقویت بخش ہوتی ہیں کہ تخریبی قوتوں کا ہجوم بھی انھیں بے اثر نہیں کر سکتا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ جوہرِ انسانیت کے نشوونما پالینے کے بعد اس کا سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھ جانا، جنت کی زندگی ہے اور نشوونما کی صلاحیت کے سلب کر چکنے کے بعد سلسلۂ ارتقا میں رک جانے کا نام جہنم کا عذاب ہے۔ اور چونکہ رکتا وہی ہے جس میں نشوونما کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی اس لئے جہنم سے سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیہ۔ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ (۱۰۱/۸) نظامِ ارتقاء کا اٹل قانون ہے۔

جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا ہے اس سے اتنی بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآن کریم کی رو سے کائنات میں سلسلہ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ یہی قانونِ ارتقاء خود انسانی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ موجودہ پیکرِ انسانی اس کے طبعی ارتقاء کی آخری کڑی ہو تو ہو، لیکن جہاں تک اصلِ انسان، یعنی اس کے جوہرِ شرفِ انسانیت کا تعلق ہے، موجودہ زندگی اس کے نمود کی اولیں کڑی ہے۔ اس کے بعد اس جوہرِ شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس ارتقاء (نشوونما) کا آغاز اسی زندگی سے ہو جاتا ہے اور طبعی موت اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ جو اس سلسلہ میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے اس کی زندگی جنت کی زندگی کہلاتی ہے۔ جنت و جہنم سے مقصود ہی یہ ہے کہ کون آگے بڑھتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ لمن شاء منکم ان یتقدم او یتاخر (۷۴/۳۷) "جو تم میں سے چاہے آگے بڑھ جائے جو چاہے پیچھے رہ جائے"۔ کل نفس بما کسبت رھین (۷۴/۳۸) اس کا فیصلہ ہر شخص کے اعمال پر منحصر ہے۔ جہنم میں نشوونما۔ تزکیہ (Growth) رک جاتی ہے۔ چنانچہ اہلِ جہنم کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے کہ ولا یزکیھم (۳/۷۷) اللہ ان کی نشوونما روک دیگا (نیز ۲/۱۷۴)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، چونکہ حیات مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے جنت اور جہنم (آگے بڑھنے کی صلاحیت اور رک جانے کا مرض) اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جنت یا جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں، کیفیاتِ زندگی کی تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کے متعلق قرآن میں ہے کہ عرضھا السمٰوٰت والارض (۵۷/۲۱) "اس کی وسعت تمام کائنات (ارض و سمٰوٰت) کو محیط ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اسی طرح جہنم کے متعلق فرمایا کہ ان جھنم لمحیطۃ بالکٰفرین (۹/۴۹) "جہنم نے کفار کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (۱۰۴/۶) "اللہ کی سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے"۔

اس دنیا میں جنت اور جہنم کی زندگی کیسی ہوتی ہے، اسے ہم دیکھ بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی ہے۔ (یہ عنوان ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق ضمنی طور پر کچھ لکھنا کافی (فلہذا مفید) نہیں ہوگا۔ اس پر مستقل طور پر الگ لکھا جائے گا) ان تصریحات کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اصولی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآن کی رُو سے ایک خاص اجتماعی نظام کے ماتحت "جنت کی زندگی" بسر ہو سکتی ہے اور اس کے برعکس، غلط نظامِ اجتماعی (معاشرے) میں جہنم کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ جنت کی زندگی کے لئے شرط اولیں "وراثتِ ارض" (یعنی اپنی مملکت کا وجود) ہے جس میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ زمر میں "اہلِ جنت" کے متعلق ہے کہ

وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء۔
فنعم اجر العاملین (۳۹/۷۴)

وہ (اس کیفیت کو دیکھ کر) پکار اٹھیں گے کہ سزاوارِ حمد اللہ کی ذات ہے جس نے اپنے قانون کے مطابق اپنے وعدوں کو ہم سے سچا کر دکھایا اور ہمیں اس مملکت کا مالک بنا دیا جس میں ہم پورے پورے طور پر صاحبِ اختیار ہیں۔ قانونِ خداوندی

کے مطابق کام کرنے والی قوموں کے لئے یہ اجر کس قدر خوشگوار ہے۔

اس مملکت میں قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ ربوبیت کی ترویج و تنفیذ سے جوہرِ شرفِ انسانیت کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے اور یہی نشوونما جنت کی زندگی کا آغاز ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جس نظام میں یہ نشوونما رک جاتی ہے وہ نظام جہنم کی زندگی کی تمہید ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت اور جہنم کو اجتماعی زندگی کے مظہر بتایا ہے۔ جنت میں بھی قوموں کی قومیں داخل ہوتی ہیں۔ (وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا ۳۹/۷۳) اور جہنم میں بھی (وسیق الذین کفروا الی جھنم زمرا ۳۹/۷۱) سورۂ اعراف میں ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والی ہر ئی قوم سے کہا جائے گا کہ جاؤ! اپنے جیسی پہلی قوموں کے ساتھ مل جاؤ۔ (قال ادخلوا فی امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس فی النار۔ ۷/۳۸) جب وہ اس میں داخل ہوگی تو اس کی ہم مشرب قوم اس پر لعنت بھیجے گی (کلما دخلت امۃ لعنت اختھا۔ ۷/۳۸) سورۂ الملک میں ہے کہ جہنم میں یہ اقوام، فوج در فوج داخل ہوں گی۔ (۶۷/۸) اسی طرح سورۂ ابراہیم میں ہے کہ الم تر الی الذین بدلوا نعمت اللہ کفرا۔ کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنھوں نے خدا کی دی ہوئی نعمت (مملکت و حکومت) کو غیر خدائی آئین کے خطوط پر تشکل کر کے اس کی ناسپاس گذاری کی اور اس طرح اس کی ابھارنے والی قوتوں کو دبا کر رکھ دیا (کفروا) اور اس طرح واحلوا قومھم دار البوار (۱۴/۲۸) اپنی پوری کی پوری قوم کو جہنم میں لے گئے۔ غور کیا آپ نے کہ کس طرح ارباب حل و عقد کی غلط روش سے پوری کی پوری قوم جہنم میں چلی جاتی ہے۔ یعنی ان کے معاشرے کا قیام نظامِ ربوبیت کے مطابق نہیں ہوتا اس لئے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اور یہی ان کے لئے جہنم ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآن نے جنت اور جہنم کی زندگیوں کی اسقدر تفاصیل بیان کر دی ہیں کہ ان سے ان اجتماعی نظامہائے حیات کا پورے کا پورا نقشہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے جن کا نتیجہ جنت یا جہنم کی زندگی ہے (یہ تفاصیل میری کتاب معارف القرآن کی آخری جلد میں شرح و بسط سے ملیں گی۔ انشاء اللہ)۔ ان نظامہائے حیات کے جو نتائج اس وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں انھیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن زندگی کی اگلی منزل (حیاتِ اخروی) کی کیفیات کس قسم کی ہوں گی، اس کا علم و احساس آج کی زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی سے پچھلی کڑی کا حیوان نہیں سمجھ سکتا کہ انسانی شعور و ادراک کی خصوصیات اور اس کے جوہر انسانیت کی کیفیات کیا ہیں۔ ان کا احساس صرف انسانی زندگی کے درجے میں پہنچکر ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح، انسان کی موجودہ زندگی میں اس حقیقت کا احساس ناممکن ہے کہ اس سے اگلی منزل کے خصائص و امتیازات کی کیا نوعیت ہوگی۔ اسلئے فرمایا کہ

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین، جزاء بما کانوا یعملون۔ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کیلئے جو کچھ پس پردہ چھپا ہوا ہے وہ کیا ہے؟

آج ان حقائق کا ادراک اور ان کوائف کا احساس ناممکن ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق قرآن کی بیان فرمودہ تصریحات یا اشارات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یہ چیزیں مشہود پیکروں میں سامنے آجائیں گی۔ وبدا لھم سیئات ما عملوا (۴۵/۳۳) ان کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں گے۔ بایں نمط کہ نشوونما سے محروم رہ جانے والے آگے بڑھ جانے والوں کی خوش بختیوں پر اپنے ہاتھ کاٹیں گے اور

فرطِ حسرت سے پکار اٹھیں گے کہ

یالیتنی قدمت لحیاتی (۸۹/۲۴)

اے کاش! میں نے اس زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا۔

یہی وہ شدتِ احساس ہوگی جو اصل جہنم کی زندگی کو اس درجہ دردانگیز و کرب آمیز بنا دیگی کہ وہ چلا اٹھیں گے کہ یلیتنی کنت ترابا (اے کاش! میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے بے جس مٹی کا تودہ ہوتا)۔

قرآن کریم میں جنت اور دوزخ کے علاوہ، ایک تیسرے مقام کا بھی ذکر ہے جسے اعراف کہا گیا ہے، اعراف اس زمین کو کہتے ہیں جو ہل چلا کر کاشت کے قابل بنالی جائے (لیکن ابھی اس میں کھیتی نہ اُگی ہو)۔ نیز، بلند جگہ کو بھی اعراف کہتے ہیں، جیسے زمین کی منڈیریں۔ ان کے متعلق ہے:۔

وعلی الاعراف رجال یعرفون کل بسیمٰھم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۷/۴۶-۴۵)

اس اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک (اہل جنت و جہنم) کو ان کی پیشانی سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ جنتیوں سے پکار کر کہیں گے، تم پر سلام ہو۔ وہ ابھی تک ان کے ساتھ شامل نہیں ہو سکے لیکن اس کے آرزومند ہیں۔

اور جب ان کی نگاہ جہنم والوں کی طرف مڑیگی تو کہیں گے کہ اے نشو و نما دینے والے! ہمیں اس ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

قرآن میں اہل اعراف کے متعلق مزید تصریح نہیں۔ ماہرین سلسلۂ ارتقاء ہمیں بتاتے ہیں کہ پچھلی منزل سے اگلی منزل کی طرف تدریجی ترقی کرتے وقت ایک درجہ ایسا بھی آتا ہے جس میں کچھ خصوصیات سابقہ منزل کی باقی ہوتی ہیں اور کچھ آنے والی منزل کی آچکتی ہیں۔ یہ درجہ دونوں منازل کے بین بین کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن مسکویہ نے (متوفی ۴۲۱ھ جو حکمائے اسلام میں نظریۂ ارتقاء کا محقق ہے) اپنے رسالہ الفوز الاصغر میں اس درمیانی منزل کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ نباتات کے تدریجی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:۔

اب یہی اثر تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نبات کو مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا بھی بڑھے تو حد نباتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کر لے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان کے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور بارآور ہونے کے لئے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے، پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کیلئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اسے کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درخت خرما تلف ہو جاتا ہے۔ بخلاف دیگر اشجار کے کہ ان کا صرف ایک ہی مبدا ہوتا ہے۔ یعنی جڑ جو زمین میں قائم رہتی ہے۔ جب تک جڑ رہے گی درخت بھی رہے گا ورنہ ضائع ہو جائے گا۔

اسی طرح حکیم موصوف، بندر اور اس کے مثل اور حیوانات کو، حیوانات اور انسان کی درمیانی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس سے قیاس

کیا جا سکتا ہے کہ اہل اعراف، اہل جنت اور اہل جہنم کی درمیانی کڑی ہیں۔ یعنی ان میں نشوونما کی صلاحیت تو ہے لیکن وہ صلاحیت مشہود نہیں ہوئی۔ وہ زمین ہل چلا کر کاشت کے قابل تو بنا دی گئی ہے لیکن اس میں ابھی کھیتی اُگی نہیں۔ اس لئے ان کا مقام اہل جنت اور اہل جہنم میں حد فاصل کا مقام ہے۔ اسی لئے قرآن نے اعراف کا ذکر کرتے وقت کہا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان ایک اوٹ ہوگی (بینھما حجاب - ۷/۴۶) اور یہی اوٹ، اعراف ہے۔ اسی کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ وہ ایک دیوار ہے جس میں ایک دروازہ ہے، باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب (۵۷/۱۳) "جس کے اندر کی طرف رحمت ہے اور باہر عذاب"۔ یعنی جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پردہ یا دیوار ہی کا فاصلہ ہے۔ ان کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ ایک قدم آگے بڑھ گئے تو اگلی منزل۔ پیچھے رہ گئے تو پچھلی منزل۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر آگے جانے والا اس پچھلی منزل میں سے ہو کر گذرے گا۔ جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوگی، وہ آگے بڑھ جائیں گے۔ جن میں یہ صلاحیت نہ ہوگی وہ وہیں رک جائیں گے۔ اسی لئے فرمایا:-

وان منکم الا واردھا[1] کان علیٰ ربک حتما مقضیا ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا (۱۹/۷۱)

تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ یہ وہ قانون ہے جو بڑے نشوونما دینے والے نے طے کر رکھا ہے۔ پھر جو لوگ اپنے آپ کو قانونِ نشوونما سے ہم آہنگ کئے ہوں گے انھیں اس سے بچا کر آگے لے جائیں گے) جن میں کمی ہوگی (ظلم) انھیں اس مقام میں اس شکل میں چھوڑ دیں گے کہ ان میں اٹھنے اور چلنے کی سکت باقی نہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے نظریۂ "نجات" کے متعلق یہ چند اجمالی اشارات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے (اس کے لئے میں نے معارف القرآن کی آخری جلد کو مخصوص کر رکھا ہے (اللہ مجھے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے)۔ ان اجمالی اشارات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر علم و بصیرت پر مبنی ہے؟ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جو علم حقیقی کا سرچشمہ اور دنیا بھر کو بصیرت عطا کرنے والا ہے۔ پھر یہ صحیفۂ مقدسہ ذہن انسانی کی آمیزش سے پاک و صاف ہے اس لئے اس میں جو کچھ ہے علم و یقین ہے۔ ظن و قیاس کا اس میں کہیں گذر نہیں۔ اس تصور کے برعکس، اس نظریۂ نجات کو دیکھئے جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے۔ وہ نظریہ، غیر اسلامی تصورات سے اخذ کردہ اور ذہن انسانی کی پیداوار ہے جس میں ہر بات کو "قیامت" پر اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآنی تصور کی رُو سے ہماری زندگی کے ایک ایک سانس میں "حساب اور کتاب" پوشیدہ ہے۔ کارگہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے جس میں ہمارے اعمال تُلتے اور ہمیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں۔ بقا ان کیلئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷) "یاد رکھو۔ باقی وہی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچاتا ہے"۔ بقا اور نشوونما کے لئے صرف اپنی ذات میں اصلح (The Fittest) ہونا ہی کافی نہیں انفع (سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا) ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ "انفعیت" صرف نظام ربوبیت میں ممکن ہے۔ لہٰذا اگر ہمارا معاشرہ نظامِ ربوبیت کے خطوط پر متشکل ہے تو اس میں ہر لمحہ، جوہر انسانیت کی نشوونما ہوتی رہتی ہے اور اس طرح ہمارے اندر باغِ جنت کے

---

[1] ورود کے معنی کسی مقام تک پہنچنے کے ہیں۔ خواہ اس کے اندر داخل ہوا جائے یا نہ۔

شگوفے کھلتے اور پھول لہلہاتے چلے جاتے ہیں اور موت کا پردہ ان کی شادابیوں میں کہیں حارج نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر ہماری زندگی نفسا نفسی (انفرادیت) کے انسانیت سوز آتشدانوں سے گذر رہی ہے تو مزرعِ حیات کی شادابیاں لمحہ بہ لمحہ خشک ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان میں نشوونما کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اور بدبختی ہے ان سوختہ سامانوں کے لئے جن کی کھیتیاں اس طرح جھلس کر رہ جائیں۔ حتی جعلنٰھم حصیدًا خٰمدین (۲۱/۱۵)۔

یہ بھی واضح رہے کہ حقائق قرآن کے متعلق جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ تجارب و مشاہدات اور علم و بصیرت کے صحیح خطوط پر آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق اور بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ حتی یتبین لھم انہ الحق[1] (۴۱/۵۳) لیکن یہ صرف گذرنے کا مقام ہوگا، رکنے کا نہیں۔ آگے بڑھنے والے، ان تلخیوں اور صعوبتوں سے دور دور رہیں گے جو رک جانے والوں کا حصہ ہوں گی۔

ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنھا مبعدون۔ لا یسمعون حسیسھا۔ وھم فی ما اشتھت انفسھم خٰلدون (۲۱/۱۰۲)

وہ لوگ جن کیلئے ہمارے قانون کے مطابق توازن قائم رکھنے والی صلاحیتیں (الحسنیٰ) آگے آگے پہنچ چکی ہیں۔ وہ اس (رکھنے والے مقام کی صعوبات) سے دور رکھے جائیں گے۔ وہ اس کی آہٹ تک بھی محسوس نہیں کرینگے۔ اس میں ان کے دل کی آرزوئیں پوری ہونگی، عارضی طور پر نہیں، دائماً۔

گذشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے جنت اور جہنم میں قیام ہمیشہ کے لئے ہوگا (خالدین فیھا ابدًا) لیکن اس دوام اور ہمیشگی سے وہ ابدیت و سرمدیت متصور نہیں جو صرف ذاتِ خداوندی کیلئے مختص ہے۔ یہ دوام، قانونِ مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں جنت اور دوزخ دونوں کے متعلق فرمایا کہ خالدین فیھا دامت السمٰوٰت والارض الا ما شاء ربک (۱۱/۱۰۷-۱۰۸)[2] وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ ارض و سما قائم ہیں مگر یہ کہ جو تیرے نشوونما دینے والے کے قانونِ مشیت میں ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والی نوع کچھ عرصہ تک علیٰ حالہٖ باقی رہتی ہے اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھنے والی نوع کچھ عرصہ تک اس اگلی منزل میں رہتی ہے، اس کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقطع ہوتا ہے کہ

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

لیکن اس غیر منقطع روانی کی ابدیت، خدا کی ابدیت کی طرح مطلق نہیں ہو سکتی۔

---

[1] میں نے ایک صاحب کے استفسار پر "ثواب" کے متعلق ایک مختصر سا مقالہ لکھا تھا۔ چونکہ اس کا تعلق بھی اس موضوع سے ہے اس لئے اسے اس مضمون کے ساتھ ہی شائع کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس میں کچھ باتیں مکرر آگئی ہوں تو ان کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

[2] آیات بالا میں اہل جنت کے متعلق "الا ما شاء ربک" کے بعد ہے عطاءً غیر مجذوذ۔ یہ عطیہ غیر منقطع ہے۔

ثواب

(پرویز)

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے، وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئیگی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بادنیٰ تعمق ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ متعدد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ بالآخران کا مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائرِ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے اس لئے کہ "مذہب" کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے مباحث نظری (Theoretical) ہوتے ہیں اور نظری مباحث میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مذہب" چونکہ انسان کے دورِ سحر (Magic Age) کی یادگار ہے، اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کے الٹ پھیر اور اعادہ سے نتیجہ پیدا کیا جائے۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے۔ عجیب مہملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے۔ لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر اس قدر زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی ردوبدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" یہ ہے "مذہب" کی صحیح تعریف۔

اسلام "مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لیکر آیا تھا جسے آج کی اصطلاح میں آئینی نظامِ زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نظامِ زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا اور جب اس کی بحث کا دائرہ عملی مسائلِ حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور بین مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں "لفظ بلا معنی" کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (Definition) میں ذرا سا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جرم ہے۔ لیکن قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اسی متعینہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل، چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظامِ زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم

متعین ہوگا۔ بلا تعینِ مفہوم، نہ قانون، قانون رہ سکتا ہے نہ آئین آئین۔ اسلام کا ضابطۂ آئین، قرآن ہے، اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کر دیتا ہے۔ اسی لئے وہ کتابِ آئین ہے۔ "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن جب قرآن کا دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے۔ ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہی الفاظ میں ایک لفظ "ثواب" بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے۔ وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ جس بات کے متعلق پوچھئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب بھی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب! ثواب ہوتا کیا ہے؟ تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہ ملے گا۔ آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز سی دکھائی دیگی۔ (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے تعجب انگیز نظر آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امرِ واقعہ ہے۔ آپ دور نہ جائیے، خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے؟ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ "ثواب" کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی۔ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کوئی اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہو یا جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے "ثواب" کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پلے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی! آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ اوامر و نواہی کے پابند نہیں۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحبِ فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے۔ اس وقت آپ کو بتانا ہوگا، اسے سمجھانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ "مذہب" کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں اسلئے تم "کیوں" نہ پوچھو، جو کچھ کہا جاتا ہے چپکے سے کئے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے عہدِ طفولیت میں تو اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ "کیوں" کے مقام تک پہنچ جائے تو ہر حکم میں کے لئے محرکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لِم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن، مذہب نہیں بلکہ دین لایا تھا اس لئے اس نے ذہنِ انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ کتاب (قانون یا حکم) کے ساتھ حکمت (اس کی لِم: کیوں) بھی بتا دی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ اس نے اپنی دعوت کی

بنیاد ہی بصیرت پر رکھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ صاحبانِ عقل و بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہونگے اس نے کھلے کھلے طور پر کہدیا کہ بدترین خلائق (شر الدواب) وہ انسان ہیں جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کا کوئی نظام ہو اس کی جاذبیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے۔ اور نتائج اس ٹھوس حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب و نقاب سامنے آجائیں۔ مبہم الفاظ، غیر متعین مفہوم، کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان "مذہبی احکام" کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ کبھی سوچنے والے ذہن کے لئے وجہِ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ متمسک رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز "عہدِ طفولیت" میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (لم) کا بھی تقاضا کرتا ہے اور حکم کی لِم اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دین (نظامِ زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثاب کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا لوٹ کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے اتنا ہی اس میں واپس آتا رہے۔ استثاب کہتے ہیں (Restoration) کو

آپ کوئی کام کیجئے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا۔ مال۔ وقت۔ توانائی (Energy) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے تو وہ نتیجہ اس کا ثواب ہوگا۔ ثاب جسمہ کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہو جائے وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند اور توانا رہے۔ آپ صبح سے شام تک کوئی کام کرتے ہیں جس کے معاوضے میں آپ کو بہت سا روپیہ ملتا ہے۔ لیکن اس کام کے کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کیلئے آپ اچھی غذا کھاتے ہیں جس سے آپ کی صرف شدہ توانائی واپس مل جاتی ہے۔ اس طرح آپ کے اس طریقِ کار کی رو سے آپ کی توانائی بھی برقرار رہتی ہے اور جو کچھ آپ کماتے ہیں وہ آپ کا منافع ہوتا ہے۔ اول الذکر (توانائی کے واپس آجانے کو) ثواب کہتے ہیں یا ثانی الذکر (حاصلِ محنت) کو فوز (Achievement)۔ یا مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (Energy) صرف ہوتی ہے۔ لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس لئے وہ صرف شدہ توانائی کو واپس لاتا ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتا ہے جس سے آپ کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثواب اور فوز ہے۔ اسلام کے نظام (الدین) میں ہر فرد اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت۔ مال۔ توانائی۔ ذہنی اور قلبی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوتوں اور قدروں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانیت کا وہ مقصدِ کلی بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان، کارگہِ عالم کے تخلیقی پروگرام میں خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظامِ زندگی کے نتائج کو "ثواب اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

ثواب اللہ خیر لمن اٰمن وعمل صالحاً (۲۸/۸۰)

جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد ایسے کام کئے جو انسانی معاشرہ میں ہمواری کا موجب ہوں تو ان کیلئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔

لہٰذا ثواب اللہ کے معنی ہیں اس نظامِ زندگی کے جیتے جاگتے نتائج جو قرآنی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ لیکن قرآن نے اس لفظ (ثواب) کے انتخاب (اور استعمال) سے ایک اور اہم حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ "مذہب" کی عمارت "ثنویت ..... (Dualism) پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی اس میں دنیا اور آخرت، روح اور مادہ، اور ملک و دین کو دو الگ الگ شعبے قرار دیا جاتا ہے جن میں نہ صرف یہ کہ باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے نقیض اور مخالف ہوتے ہیں اور دونوں ایک جگہ سما نہیں سکتے۔ لیکن قرآن نے اس ثنویت (دین اور دنیا کی علیحدگی) کو تصورِ باطل قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ نظامِ زندگی ان دونوں کے تانے اور بانے سے ملکر بنتا ہے۔ نہ اکیلا تانا کسی مطلب کا ہوتا ہے نہ بانا۔ دیکھئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس حسن و خوبی سے، دو لفظوں میں نکھار کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایحسب الانسان ان یترک سدی (۷۵/۳۶) اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا گیا ہے؟" لیکن اس کے صحیح مفہوم کا راز لفظ سدی میں ہے۔ سدی کے معنی ہیں کپڑے کا تانا۔ یعنی صرف تانا ہی تانا۔ اس کے ساتھ بانا نہیں۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کا یہ تصور کہ زندگی صرف تانے ہی تانے کا نام ہے، تصورِ باطل ہے۔ تانا اور بانا الگ الگ رکھئے اس سے کپڑا نہیں بن سکتا۔ جب ان دونوں کو ایک دوسرے میں بُن دیا جائے تو وہ کپڑا بن جاتا ہے۔ کپڑے کو ثوب کہتے ہیں۔ یعنی مستقل اور درخشندہ نتائج صرف اسی نظام سے مرتب ہو سکتے ہیں جس میں روح اور مادہ، دنیا اور آخرت اور ملک و دین کو باہمد گر سمو دیا جائے اور اس طرح حالتِ سدی کو کیفیت ثوبی سے بدل دیا جائے۔ یہ نتائج، اعمال ثواب ہیں۔

دنیا کے عام نظاہائے معاشرت (جن کی اساس مستقل اقدار پر نہیں ہوتی) طبعی قوانین کے مطابق اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں جو شخص اچھی خوراک کھائے گا تندرست و توانا رہے گا۔ لیکن ان نتائج کا تعلق انسان کے پیش پا افتادہ مفاد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ انھیں قرآن ثواب الدنیا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا سوچو! یہ تمہاری کس قدر بھول ہے کہ تم اتنی تگ و تاز بھی کرتے ہو لیکن اس کے بعد صرف قریبی مفاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ اگر تم اپنے معاشرے کو مستقل اقدار (وحی) کے خطوط پر متشکل کر لو تو اسی تگ و تاز سے، یہ قریبی مفاد بھی حاصل ہو جائیں اور ان کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا جائے۔ ان نتائج کا نام ثواب الدنیا والآخرۃ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ من کان یرید ثواب الدنیا۔ جو لوگ صرف قریبی مفاد تک ہی رک کر رہ جاتے ہیں ان سے کہو کہ فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرۃ (۴/۱۳۴) نظامِ خداوندی میں قریب اور بعید دونوں کے مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ سوچو تاؤ کہ یہ نظام اچھا ہے یا تمہارا نظام۔ ظاہر ہے کہ نظام وہی اچھا ہوگا جس کے نتائج کا سلسلہ حیاتِ انسانی کے ساتھ ساتھ، مسلسل قائم رہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو کہ اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ۔ دنیا اور آخرت دونوں میں ایسی زندگی جس میں ہر شے کا توازن ٹھیک ٹھیک طور پر قائم رہے۔ قرآن کی رو سے نظامِ زندگی کے تین انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ نظام جس کے خوشگوار نتائج انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں چلتے رہیں۔ اور اس طرح یہاں سے وہاں تک شاہراہِ حیات شگفتہ و شاداب رہے۔ یہ ہے الدین کا وہ نظام جس میں ثواب الدنیا

والاخرۃ، دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور اپنی نگاہوں کو صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس نظام زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔ وھم فی الاخرۃ من خلاق۔ اس کے بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ خالص دنیا داری کی زندگی ہے۔

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں نہ اس کے بعد کی زندگی کی۔ یہ ہے "مذہب کی زندگی"۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت وخواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیاتِ ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ نفس کا فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً۔ کیا تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ لیکن وہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں، اولئک الذین کفروا بایات ربھم ولقائہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانونِ خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں۔ اس طرح کہ حقائق کا آمنا سامنا کرنے (To Face realities) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ فحبطت اعمالھم۔ ان کے کام، بظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا۔ (۱۸/۱۰۳)۔ یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ قیامِ انسانیت کے سلسلہ میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔ "مذہب پرست" طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی۔ آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں۔ لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ۔ اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہی کے حصہ میں آجائیں لہٰذا۔

(۱) اسلام کے نظامِ حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں ——— (۲) عام دنیاوی نظام میں، صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے ——— (۳) اور مذہب کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ مسلمان صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ثواب کے معنی ہیں:-

اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور جس سے ہماری دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو اور اس سے مسلسل بعد کی زندگی بھی۔

جو اعمالِ حیات، اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے، یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا ——— اب آپ اپنے لئے خود میزان قائم کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے، اور کون کون سے ایسے جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ

نسخہ اور اس کا استعمال

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھر رہا تھا۔ حکیم صاحب باری باری ایک ایک مریض کی نبض دیکھتے۔ شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا اور ترکیب استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لیکر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیب استعمال سمجھ لی ہے؟ اس نے کہا "جی ہاں! گرم پانی میں اچھی طرح جوش دیکر۔ چھان کر۔ سوتے وقت پی لینا ہے۔ ایک ہی مرتبہ"۔ حکیم صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ ہاں! احتیاط سے پینا اور کل صبح آکر اطلاع دینا۔ مرض معمولی نہ سمجھنا۔

دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہ ہاں کہو کچھ فرق محسوس ہوا؟ مریض نے کہا کہ "نہیں حضور! کچھ فرق نہیں۔ بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے"۔ حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا، ایک گہری لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا "اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ"۔

"نسخہ!" مریض نے کہا "حضور نسخہ تو میں نے جوش دیکر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں"؟ حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں۔ "کیا کہا! نسخہ پی لیا"۔ "جی حضور نسخہ جوش دیکر چھان کر پی لیا! چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھلنی میں رہ گئے تھے۔ انھیں میں نے پھینک دیا تھا"! حکیم صاحب کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ جوش غضب میں بولے "ارے بدبخت۔ ایسا احمق! نسخہ کو جوش دیکر پی گیا"؟ مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی اس نے تو بالکل ایسا ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے پھر چلا کر کہا "ارے بیوقوف! کبھی نسخہ کو جوش دیکر بھی پیا کرتے ہیں"؟ مریض ابھی تک ششدر تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یا گل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھیں انھیں دوائی خانہ سے لینا تھا اور وہ دوائیاں جوش دیکر پینی تھیں۔ نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں"۔ مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا۔

مریضوں کے ہجوم میں ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس گیا۔ شام تک شہر کے گلی، محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا۔ جو سنتا قہقہہ لگاتا لیکن نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں۔ خود اپنے آپ پر ہنسنا ہے۔ اُسے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیم مطلق نے نسخہ دیا تھا جس کی حذاقت پر اس کا ایمان ہے۔ وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور پیچیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب ہوا تھا۔ لیکن اس نے اس نسخہ کے ساتھ بعینہٖ وہی کچھ کیا جو متذکرہ صدر مریض نے کیا تھا جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا ہے۔ اس نے اس نسخہ عظیمہ کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا۔ کبھی تعویذ بنا کر گلے میں لٹکایا کبھی زعفران اور مشک و عنبر سے لکھ کر دھو دھو کر پینا شروع کر دیا۔ کبھی دوائیوں کے نام کی گنتی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مشکل اندر مشکل

یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا، تو جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر طرہ یہ کہ نسخے کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ ایسی ایسی جلیل القدر ہستیاں بھی جنھیں خود طبیب ہونے کا دعوےٰ ہے۔ کہئے! جس قوم کی حالت یہ ہو جائے اس کی شفایابی کی کیا امید ہو سکتی ہے!! افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ وہ نسخہ کیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا، اس کی عظمت کیا ہے۔ وہ عدیم المثال اور عظیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق خود اس حکیم مطلق کا ارشاد ہے کہ

فلا اقسم بمواقع النجوم۔ وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون۔ لا یمسہ الا المطہرون۔ تنزیلا من رب العلمین (۵۶/۷۵-۸۰)

(اے راہ گم کردہ انسانو! میں تمہیں اس لامحدود وسعتوں والے آسمان کے) ستاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں۔ اگر تمہیں علم ہوتا تو تم سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے۔ کہ یہ قرآن بڑی ہی قابل قدر و عزت کتاب ہے۔ (جس کے حقائق فطرت کے) چھپے ہوئے صحیفے میں (لپٹے پڑے) ہیں جنھیں پاک اور (اہل) انسانوں کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا (اسلئے کہ) یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کا پرورش کرنے والا ہے۔

غور فرمائیے! رصدگاہ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر، عزت و تکریم والی کتاب ہے۔ یہ نسخۂ عظیم کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر اور نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بلند اور یقینی ہے۔ لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انھیں کے لئے ہوگا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے "جوش دیکر پی جائیں گے" انھیں فائدہ تو ایک طرف الٹا نقصان ہوگا۔

وننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمۃ للمؤمنین ولا یزید الظلمین الا خسارا۔ (۱۷/۸۲)

اور ہم نے جو کچھ قرآن میں سے نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے (یکسر) شفا اور رحمت ہے۔ لیکن جو اس کا صحیح[1] استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آجائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے۔ لیکن اگر نسخہ کے انوکھے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے۔ گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کر دی جائے اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس انوکھے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے تو نتیجہ سوائے خسران کے اور کیا ہوگا!

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے۔ اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو۔ نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے۔ قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشئ فی غیر موضعہ۔ المختص بہ (المفردات) کسی شے کا غیر محل استعمال۔

اس سے پیشتر طلوع اسلام کے صفحات پر قرآن کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے جا چکے ہیں۔ جو ہمارے علوم دینیہ کے مرکز دیوبند شریف سے شائع ہونے والے رسالہ خالد سے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک ایسی بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں جو ہندوستان کے ارباب شریعت وطریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ علوم شریعت میں بھی مرجع انام تھی اور رموز طریقت میں بھی بے شمار انسانوں کے نزدیک منبع فیوض۔ قرآن کریم کے مفسر و مترجم، بے شمار کتب دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین، ان کی وفات کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ ان کے ارشادات کو دیکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ جب خود ایک حکیم الامت نسخہ کو جوش دیکر پینا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرے تو مریضوں کا خدا حافظ!

لیجئے اب لطائف ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک لطیفہ کے بعد ہم نے آیت متعلقہ کا ترجمہ (جس سے مفہوم سمجھ میں آجائے) قوسین میں لکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

(۱) فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۝

خاصیت:- یہ آیت پڑھ کر خربوزہ یا کوئی چیز تراشے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں دلذیذ ہوگی۔

(آیت کا مطلب:- سورۂ بقر میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ ایک گائے (یا بیل) ذبح کریں۔ انھوں نے اس سیدھے سادے حکم کی تعمیل میں بیسیوں حجتیں کیں اور بصد مشکل اس پر آمادہ ہوئے۔ فذبحوھا۔ پس انھوں نے ذبح کیا۔ وما کادوا یفعلون۔ اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں۔ یہ تھا قرآن کا مفہوم اور یہ ہے اس آیۂ مقدسہ کا استعمال جسے حکیم الامتؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ غالباً لفظ ذبح سے خربوزہ تراشنا لکھا گیا ہے۔)

(۲) افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموٰت والارض طوعاً وکرھاً والیہ یرجعون ۝

خاصیت:- اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی و شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھکر اس کے کان میں پھونک دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ سیدھا ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:- کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ (انھیں دیکھنا چاہئے کہ) آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً وکرہاً اسی کے (قانون کے) سامنے جھکا ہوا ہے۔ اور سب کی گردشیں اسی محور کے گرد ہیں۔ یعنی جب کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے؟)

(۳) انی توکلت علی اللہ ربی وربکم ما من دابۃ الا ھو اخذ بناصیتھا ان ربی علی صراط مستقیم ۝

خاصیت:- اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پکڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تابعدار اور مسخر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:- میں اس اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (اور جس کا قانون مکافاتِ عمل ایسا محکم گیر ہے کہ) کوئی جاندار ایسا نہیں جسے وہ پیشانی سے پکڑ کر اس سے مواخذہ نہ کرے۔ یقیناً میرا رب ایک توازن بدوش راستہ پر ہے۔ یعنی اللہ کے قانون مکافاتِ عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔)

(۴) کلبھم باسط ذراعیہ

خاصیت:- اگر راستہ میں کوئی شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچادے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:- سورۂ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے۔ آیت اور خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے۔)

(۵) اذا السماء انشقت ۰ واذنت لربھا وحقت ۰ واذا الارض مدت ۰ والقت ما فیھا وتخلت ۰

خاصیت: ان آیتوں کو لکھ کر ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران میں باندھ دے انشاء اللہ تعالیٰ بہت آسانی سے ولادت ہوگی۔ مگر بعد ولادت تعویذ کو فوراً کھول دینا چاہئے اور اسی عورت کے سر کے بال کی دھونی مقام خاص پر دینا مفید ولادت ہے۔

(آیات کا مطلب:- یہ سورۂ انشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ ترجمہ یہ ہے "جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اس لائق ہے۔ اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اگل کر خالی ہو جائے گی"۔ ربط ظاہر ہے)

(۶) اگر دردِ زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالکؒ (مجموعہ احادیث) پہ ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائے گی۔

(۷) فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم ۰

خاصیت:- جس سے حاکم ناراض وخفا ہو۔ وہ اس آیت کو پڑھا کرے یا لکھ کر بازو پر باندھ لیوے انشاء اللہ تعالیٰ حاکم مہربان ہو جائیگا۔

(مطلب: اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ان سب کے خلاف تیرے لئے کفایت کرے گا وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔)

(۸) جو شخص ساتوں حٰم کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو جائیں گے۔

(۹) ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو ج عالم الغیب والشھادۃ ج ھو الرحمٰن الرحیم۔

خاصیت: اسم اعظم اس میں مخفی ہے۔ جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا درجہ پائے گا اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

(ترجمہ:- "اللہ کی ذات وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ وہ غیب وشہادت کا جاننے والا اور رحمٰن و رحیم ہے۔)

(۱۰) القیّوم

خاصیت: اس کی کثرت سے نیند آتی ہے۔

(القیوم۔ یعنی۔ ایسا قائم کہ جسے اپنے قیام و بقا کے لئے کسی آسرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً "نیند" کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیوم کے بعد ہے کہ نہ اسے نیند چھو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر سے تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہئے۔)

(۱۱) المغنی

خاصیت:۔ اگر مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔ (المغنی سب سے بے نیاز اور سب کی حاجت روا)

(۱۲) الرحمن الرحیم۔

خاصیت:۔ اگر طالب مطلوب کا نام مع نام والدہ کے لکھے، اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

(۱۳) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خاصیت:۔ اگر یہ آیت پڑھ کر گم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور مل جائے ورنہ غیب سے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔

(مطلب آیت:۔ قرآن کریم میں مصائب و مشکلات میں استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ جماعت مومنین کا مطمع نگاہ یہ ہونا چاہئے کہ ہماری تمام جدوجہد مشیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ اور ہماری سعی و عمل کی تمام گردشیں اسی کے قانون کے محور کے گرد گھومتی ہیں)

(۱۴) یا ایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شئ عظیم۔

خاصیت:۔ حفظ حمل کے لئے مفید ہے۔

(مطلب: اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک عظیم شے ہے۔)

(۱۵) اگر پوری سورۂ نوح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔

اتنے ہی ارشادات کافی ہیں زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ورنہ کتاب میں تو بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں۔ ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے قرآن کے اعمال۔ حالانکہ قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا تھا جو قرآن کے احکام کی اتباع میں سرزد ہو۔ مولف کتاب نے ایک اور دلچسپ لطیفہ بھی لکھا تھا۔

احقر کو حضرت مرشدی۔۔۔۔ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجتمند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو۔ چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس حاجت کے مناسب کوئی آیت قرآنی یا کوئی آسم الٰہی سوچ کر لکھ دیتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس میں برکت ہوتی ہے چنانچہ ایک بی بی کی مانگ باوجود کوشش بار بار کے سیدھی نہ نکلتی تھی۔ احقر نے کہا اھدنا الصراط المستقیم پڑھ کر مانگ نکالو۔ چنانچہ اس کا پڑھنا تھا کہ مانگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی

طالب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امید نفع اور برکت ہے۔

غور فرمایئے! ان "اعمال قرآنی" نے خود قرآن کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس زندگی میں فراخیٔ رزق، نیک اولاد، دشمن پر غلبہ، عزت کی زندگی، شیطان سے دوری، غیبی خزانوں کا علم، چوری سے حفاظت، ادائیگی قرض، جملہ جسمانی امراض سے شفا، اور آخرت میں جنت، شہادت کا مرتبہ، رسول اللہؐ کی شفاعت، دوزخ سے نجات۔ غرضیکہ اس زندگی اور آئندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنا کی جا سکتی ہے وہ چند اوراد اور وظائف کے پڑھنے سے یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے غیر مشروط طور پر گارنٹی دی گئی ہے اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی جس کیلئے قرآن کریم کو ضابطۂ حیات بنایا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمال قرآنی جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ کا ضابطۂ زندگی بنے تھے، کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے ہیں۔ اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کے لئے (Short cut) قرآن کی آیات کے ان "باطنی معانی" میں مضمر ہے جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزما مرحلے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی ہے۔

بہشتے بہر ارباب ہم است — بہشتے بہر پاکانِ حرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے فی سبیل اللہ ہم است (اقبال)

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اوراد و وظائف کو خود کر کے دیکھ لیجئے ان میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ ہمیں بھی معلوم ہے کہ ایک حد تک اثر ہو سکتا ہے لیکن یہ اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ ورد قرآن کی آیت کا کیا گیا ہے۔ جو لوگ قرآن کریم سے واقف بھی نہیں ہوتے اور کھلا ہوا شرک کرتے ہیں، وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے ہیں جو تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائف قرآنی سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں۔ کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی فنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس (Phenomenon) کا تعلق علم النفس (Psychology) سے ہے۔ ایک خاص طریقے سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ پڑھئے یا لکھئے اس قسم کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی طویل ہے، جسے ہم انشاءاللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ کس طرح نسخے کا یہ انوکھا استعمال طبیب مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثینِ کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کیلئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ ان کی وہ عملی قوتیں جو انھیں دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں مفقود ہو چکی ہیں۔ قرآن کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں تو کہیں ہے نہیں۔ یہ سب عجمی اثرات کا نتیجہ ہے۔

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے مضامین کا مجموعہ

قیمت چار روپے

ماڈرن مُلّا

کاروباری دنیا کے خاص انداز ہوتے ہیں جنھیں بزنس کی ٹکنیک کہا جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں بزنس کی ٹکنیک یہ ہے کہ مال خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، اس کا پیکنگ نہایت شاندار ہونا چاہیئے۔ اور چار آنے کی چیز پر بارہ آنے اشتہار پر صرف کر دینے چاہئیں۔ اشتہار میں جدت ہونی چاہیئے اور پرانے، فرسودہ، طریقوں کی مذمت کے بعد بتانا یہ چاہیئے کہ ہمارا مال، دورِ حاضرہ کی (Latest) تراکیب کے مطابق تیار کیا گیا ہے اس لئے یہ بالکل اپٹوڈیٹ (up to date) ہے۔

مُلّا بہت پرانا کاروباری ہے۔ اس کے معاش کا ذریعہ ہی مذہب ہے۔ اس دور میں مذہب کی فرسودگی کے خلاف عام جذبۂ بیزاری پیدا ہوا تو ملا کے کاروبار میں کساد بازاری شروع ہو گئی۔ ان میں سے چالاک دکانداروں نے اس مسئلے پر غور کیا تو وہ اس راز کو پا گئے کہ اس زمانے میں جب تک اسی زمانے کی بزنس ٹکنیک سے کام نہیں لیا جائے گا، کاروبار چل نہیں سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے آہستہ آہستہ اس ٹکنیک کو اختیار کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلی چیز جو اس کاروبار کی راہ میں حائل ہو رہی تھی، وہ مُلّا کا پرانا سٹائل تھا۔ ان ہوشیار دکانداروں نے اس فرسودہ سٹائل کی جگہ نئے صحافتی سٹائل کو اختیار کیا اور اس طرح اُسی پرانے مال کو نئے پیکنگ کا پیرہن پہنا دیا۔ سٹائل کے ساتھ مُلّا کے پرانے لٹریچر کا انداز اشاعت بھی دقیانوسی (نولکشوری) رنگ کا ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے لٹریچر کا لباس (get up) بھی نہایت جاذب توجہ تیار کرا لیا۔ اس کے بعد ایڈورٹزمنٹ کی باری آئی۔ اس کیلئے انھوں نے مُلّا کی جامد دقیانوسیت کو کوسنا شروع کر دیا تاکہ عوام کو یہ معلوم ہو کہ ان کا مال، مُلّا کا پرانا مال نہیں، بالکل تازہ اور نیا مال ہے۔ اس طرح انھوں نے وہی پرانا، سڑا ہوا مال، محض پیکنگ اور اشتہار کے زور پر نیا کر کے بیچنا شروع کر دیا اور ان کی تجارت بڑی کامیاب رہی۔ ان کامیاب دکانداروں میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے۔ انھوں نے دورِ حاضر کی بزنس ٹکنیک کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور اسے نہایت چابکدستی اور پرکاری سے اپنایا ہے۔ آپ ان کی تحریروں کو دیکھئے۔ اسلوب بیان صحافتی، پیش کرنے کا انداز بالکل دورِ حاضرہ کے مطابق۔ ملازم کی کورانہ تقلید اور قرسانی جمود کے خلاف طعن و تشنیع۔ سطح بین نگاہیں فوراً اس دامِ تزویر میں پھنس جاتی ہیں۔ لیکن جب اس حسین و دلکش پیکنگ کو کھول کر دیکھئے تو وہی ملا ازم اور وہی اس کی سڑانڈ۔ مثلاً آپ اگست ۱۹۵۱ء کا ترجمان القرآن اٹھائیے۔ یہ مجموعہ ہے ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ان تقاریر کا جو ریڈیو سے وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہیں۔ ان میں ایک عنوان ہے "معراج کی رات" اس عنوان کے ماتحت ایک تقریر کی تمہید کے یہ الفاظ ہیں:

معراج کا واقعہ حضرت محمدؐ کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے۔ لیکن یہ جس قدر مشہور ہے

اسی قدر افسانوں کی تہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ ان کی عجائب پسندی کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیئے۔ اس لئے معراج کی اصل اور اس کی غرض اور اس کے فائدوں اور نتیجوں کو تو انھوں نے نظر انداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرتؐ جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی؟ براق کیا تھا؟ اور فرشتے کس شکل کے تھے؟ حالانکہ یہ واقعہ تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنھوں نے زمانے کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا۔

اس تمہید کی اٹھان پر غور کیجئے۔ نظر آتا ہے کہ کہنے والا ملازم کی افسانہ پرستی اور عجوبہ پسندی سے سخت بیزار ہے۔ واقعہ معراج میں براق اور فرشتوں کی شکل وصورت کی دقیانوسی چیستانوں میں نہیں الجھنا چاہتا بلکہ اس کی اس غایت کبریٰ سے بحث کرنا چاہتا ہے جس نے تاریخ انسانیت پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

کیسا جاذب نگاہ ہے یہ پیکنگ اور کتنی دلکش اور رنگین ہے اشتہار کی یہ سلائڈ۔ بھولا خریدار اس سربمہر پیکٹ کو خرید لیتا ہے اور جب گھر آکر کھولتا ہے تو اس میں سے حسب ذیل مال نکلتا ہے:۔

معراج کا سفرنامہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے ۱۲ سال گذر چکے تھے۔ ۵۲ برس کی عمر تھی۔ حرم کعبہ میں سو رہے تھے۔ یکایک جبریلؑ فرشتے نے آکر آپ کو جگایا۔ نیم خفتہ ونیم بیدار حالت میں اٹھا کر آپ کو زمزم کے پاس لے گئے۔ سینہ چاک کیا۔ زمزم کے پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اسے علم اور بردباری اور دانائی اور ایمان ویقین سے بھر دیا۔ اس کے بعد آپ کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام "براق" تھا۔ پہلے انبیاء بھی اسی نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا۔ جبریلؑ نے تھپکی دے کر کہا دیکھ کیا کرتا ہے، آج تک محمدؐ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پھر آپ اس پر سوار ہوئے اور جبریلؑ آپ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ کی تھی جہاں اتر کر آپ نے نماز پڑھی۔ جبریلؑ نے کہا اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طور سینا کی تھی جہاں خدا حضرت موسیٰؑ سے ہم کلام ہوا۔ تیسری منزل بیت لحم کی تھی جہاں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔

اس سفر کے دوران میں ایک جگہ کسی پکارنے والے نے پکارا ادھر آؤ۔ آپ نے توجہ نہ کی۔ جبریلؑ نے بتایا یہ یہودیت کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی ادھر آؤ۔ آپ اس کی طرف بھی ملتفت نہ ہوئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ عیسائیت کا داعی تھا۔ پھر ایک عورت نہایت بنی سنوری نظر آئی اور اس نے اپنی طرف بلایا۔ آپ نے اس سے بھی نظر پھیر لی۔ جبریلؑ نے کہا یہ دنیا تھی۔ پھر ایک بوڑھی عورت سامنے آئی۔ جبریلؑ نے کہا دنیا کی عمر کا اندازہ اس کی عمر سے کر لیجئے۔ پھر ایک اور شخص ملا جس نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنا

چاہا مگر آپ اسے بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ جبریلؑ نے کہا یہ شیطان تھا جو آپ کو راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔

بیت المقدس پہنچکر آپ براق سے اُتر گئے اور اسی مقام پر اُسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے پہنچتے ہی نماز کے لئے صفیں بندھ گئیں۔ سب منتظر تھے کہ امامت کے لئے کون آگے بڑھتا ہے۔ جبریلؑ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ نے سب کو نماز پڑھائی۔ پھر آپ کے سامنے تین پیالے پیش کئے گئے۔ ایک میں پانی۔ دوسرے میں دودھ، تیسرے میں شراب۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ جبریلؑ نے مبارکباد دی کہ آپ فطرت کی راہ پا گئے۔

اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبریلؑ اس کے ذریعہ سے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ محافظ فرشتوں نے پوچھا کون آتا ہے؟ جبریلؑ نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریلؑ نے کہا محمدؐ۔ پوچھا کیا انھیں بلایا گیا ہے؟ کہا ہاں۔ تب دروازہ کھلا اور آپ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریلؑ نے بتایا یہ آدمؑ ہیں آپ کے مورثِ اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ نسلِ آدم ہے۔ آدمؑ اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بُرے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں۔

پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے جاتے ہیں اتنی ہی وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انھیں نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہ دیتے تھے۔

پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا۔ مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا تھا۔

پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں جو

بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر نہ جا سکا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا یہ اس شخص کی مثال ہے جو غم ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کر جاتا ہے پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے۔

انہی کے قریب کچھ اور لوگ تھے جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتے اور ان کی عزت پر حملے کیا کرتے تھے۔

کچھ اور لوگ دیکھے جن کے ہونٹ اونٹوں کے مشابہ تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ یتیموں کا مال ہضم کرتے تھے۔

پھر دیکھا کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بے انتہا بڑے اور سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آتے جاتے والے ان کو روندتے ہوئے گذرتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ پوچھا یہ کون ہیں۔ کہا گیا یہ سود خوار ہیں۔

پھر کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے ایک جانب نفیس چکنا گوشت رکھا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہ اچھا گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے حلال بیویوں اور شوہروں کے ہوتے ہوئے حرام سے اپنی خواہشِ نفس پوری کی۔

پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ پوچھا یہ کون ہیں؟ کہا گیا یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے اپنے شوہروں کے سر ایسے بچے منڈھ دیئے جو اُن کے نہ تھے۔

انہی مشاہدات کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ایک ایسے فرشتے سے ہوئی جو نہایت ترش روئی سے ملا۔ آپ نے جبریلؑ سے پوچھا، اب تک جتنے فرشتے ملے تھے سب خندہ پیشانی اور بشاش چہروں کے ساتھ ملے، ان حضرت کی خشک مزاجی کا کیا سبب ہے؟ جبریلؑ نے کہا اس کے پاس ہنسی کا کیا کام، یہ تو دوزخ کا داروغہ ہے۔ یہ سن کر آپ نے دوزخ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے یکایک آپ کی نظر کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا اور دوزخ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی۔

اس مرحلہ سے گذر کر آپ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابر میں دو نوجوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں۔

تیسرے آسمان پر آپ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلہ میں ایسا تھا جیسے تاروں کے مقابلہ میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ آپ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو

ایک عظیم الشان محل (بیت المعمور) دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے پاس آپ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ سے بہت مشابہ تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

پھر مزید ارتقاء شروع ہوا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے جو پیش گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رُک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور فرامین براہ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی ذہن میں اس کا تصور تک گذر سکا۔

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریلؑ ٹھہر گئے اور آپ تنہا آگے بڑھے۔ ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہ جلال سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔

(۲) سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں تعلیم فرمائی گئیں۔

(۳) شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

(۴) ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پیشیِ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے روداد سن کر کہا میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں، میرا اندازہ ہے کہ آپ کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکتی۔ جائیے اور کمی کے لئے عرض کیجئے۔ آپ گئے اور اللہ جل شانہ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ پلٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر وہی بات کہی۔ ان کے کہنے پر آپ بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں۔ آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔

واپسی کے سفر میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے۔ یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپ نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی۔ پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔

صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچا زاد بہن اُمِ ہانیؓ کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انھوں نے آپ کی چادر پکڑ لی اور کہا خدا کے لئے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنایئے گا ورنہ ان کو آپ کا مذاق اڑانے کے لئے ایک اور شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ مگر آپ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔ حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا کوئی تازہ خبر؟ فرمایا ہاں۔ پوچھا کیا؟ فرمایا یہ کہ میں آج کی رات بیت المقدس گیا تھا۔ کہا بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟ فرمایا ہاں۔ کہا قوم کو جمع کروں؟ سب کے سامنے یہی بات کہوگے؟ فرمایا بیشک۔ ابوجہل نے آوازیں دے دے کر سب کو جمع کر لیا۔ اور کہا لو اب کہو۔ آپ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن! محال!

پہلے تو شک تھا، اب یقین ہوگیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔

آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سنکر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے کہ یہ محمدؐ کے دست راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔ انھوں نے یہ قصہ سُن کر کہا اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا، اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے۔ رسول اللہ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا کیا واقعی آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ جواب دیا ہاں۔ کہا بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے، آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔ آپ نے فوراً نقشہ بیان کرنا شروع کردیا اور ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔ وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے جو تجارت کے سلسلے میں بیت المقدس جاتے رہتے تھے۔ وہ سب دلوں میں قائل ہوگئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ فرمایا جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گذرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے، ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتایا۔ واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلہ کا قافلہ مجھے ملا۔ سب لوگ سو رہے تھے، میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور راستے پتے آپ نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہوگئیں مگر دل ہی سوچتے رہے کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

یہ ہے معراج نبویؐ کا وہ بصیرت افروز اور حقائق پرور بیان جسے مُلا کی افسانہ پرستیوں اور اعجوبہ پسندیوں نے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا اور جو دور حاضرہ کی اس مجددیت کے صدقے میں پھر سے امتِ مرحومہ کے سامنے آیا۔ ذرا ان حقائق و غوامض پر غور فرمائیے۔ زمزم کے کنارے حضورؐ کا سینہ چاک کیا جاتا ہے۔ سواری کے لئے خچر سے کچھ چھوٹا، سفید رنگ کا جانور پیش کیا جاتا ہے۔ جب حضورؐ اس پر سوار ہونے لگتے ہیں تو وہ چمکتا ہے لیکن حضرت جبریلؑ کے بتانے سے کہ سوار کون ہے، چپ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بیت المقدس پہنچکر اس جانور کو باندھ دیا جاتا ہے (اور برق کی رفتار سے اڑنے والا ایک رسی سے بندھ کر بے بس کھڑا ہو جاتا ہے۔) واپسی پر اس سے قافلے والوں کے اونٹ بدکتے ہیں، اور حضورؐ اہلِ کارواں کو گم گشتہ اونٹ کا پتہ بتاتے ہیں۔ حضورؐ کو پیاس لگتی ہے تو راستے میں ایک قبیلہ کے قافلے کے برتن سے پانی پیتے ہیں۔ بیت المقدس سے سیڑھی کے ذریعے آسمان پر چڑھتے ہیں اور سیڑھی ہی کے ذریعے واپسی پر نیچے اترتے ہیں۔ آسمانوں کے محافظ فرشتے دروازہ نہیں کھولتے جب تک جبریلؑ حضورؐ کا تعارف نہیں کراتے۔ (انھیں خدشہ ہے کہ جبریلؑ یونہی کسی غیر معتبر آدمی کو ساتھ لیکر نہاں خانۂ اسرار الٰہیہ میں

نہ گھس آئے)۔ آسمانوں پر جن آیات اللہ الکبریٰ کا شاہرہ ہوتا ہے ان میں وہ لوگ ہیں جن کے سر کچلے جا رہے ہیں۔ زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ پتھر میں سے موٹا سا بیل نکلتا ہے اور اس میں واپس نہیں گھس سکتا۔ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں کچھ عورتیں ہیں جو چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ خدا پچاس نمازوں کا حکم دیتا ہے اور وہ حضرت موسیٰؑ کے کہنے پر عمل کرنے سے پانچ رہ جاتی ہیں۔

آپ ان تفاصیل پر غور فرمائیے! کیا کہیں کسی قسم کی افسانہ تراشی اور اعجوبہ پسندی کی کوئی جھلک بھی آپ کو دکھائی دیتی ہے؟ یہ تمام تفاصیل محض سنی سنائی باتوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات اُس "معراج نامے" میں موجود ہے جسے ہمارے ہاں کی بڑی بوڑھیاں، قرآن شریف کے ساتھ جزودان میں بند کر کے رکھا کرتی تھیں اور جو "زیارتیں دکھانے والی" عورتوں کی گداگری کا آسرا بنا کرتی تھیں۔

مال وہی ہے۔ بس پیکنگ اور اشتہار میں فرق ہے۔ یہ ہے بزنس کی وہ ٹکنیک جس میں ایک ہوشیار دکاندار کی کامیابی تجارت کا راز پوشیدہ ہے۔ واحل اللہ البیع اور اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

اس مجموعے میں قرآنی، تاریخی، علمی اور ادبی ہر قسم کے مضامین ہیں۔ علامہ موصوف کا تبحر علمی، ان کا سلیس و شگفتہ طرزِ تحریر اور مضامین کا خوشگوار تنوع

یہ گلہائے رنگا رنگ اسی ایک شاخ میں ملیں گے

ضخامت چار سو صفحات — قیمت۔ چار روپے

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

تاریا مضراب!

سابقہ اشاعت میں ہم نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جس ابوالکلام آزاد کو قائداعظمؒ نے (Show - Boy) کہا تھا، اُسے آج قائداعظمؒ کے دوش بدوش معمارانِ پاکستان کی صف میں کھڑا کیا جا رہا ہے۔ اس پر ہمیں چند نوجوان طالب علموں کی طرف سے استفسار موصول ہوا ہے کہ اس تلمیح (Show - Boy) کی تفصیل کیا ہے اور یہ واقعہ کس طرح ہوا تھا؟

جو لوگ پاکستان کی جنگِ آزادی میں شریک کار زار تھے یا جن کے ذہن میں اُس زمانے کی تاریخ مستحضر ہے انھیں اچھی طرح یاد ہے کہ (Show-Boy) کی تلمیح کی تفصیل کیا ہے؟ یہ لفظ اس زمانے میں ایک ایک شخص کی زبان پر تھا اور ابوالکلام صاحب آزاد تو اس کے بعد یاد ہی اس تعارف نامے سے کئے جاتے تھے۔ لیکن مرورِ زمانہ بھی عجیب چیز ہے۔ ہمارے مستفسر نوجوان اس زمانے میں بچے تھے اس لئے ان کے کان اس اصطلاح سے ناآشنا ہیں۔ اسی طرح رفتہ رفتہ تاریخ اقوام کی اہم یادداشتیں لوحِ زمانہ سے محو ہو جاتی ہیں اگر انھیں صفحۂ قرطاس پر محفوظ نہ کر لیا جائے۔

ہم نے سوچا کہ اگر طلوعِ اسلام میں اس واقعہ کے متعلق کچھ تفصیلاً لکھا ہوا ہو تو ان استفسارات کا جواب اسی کی روشنی میں دیا جائے۔ اس خیال سے جب اس کی پرانی جلدوں کی ورق گردانی کی گئی تو دیکھا کہ اس موضوع پر ایک مفصل مقالہ طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "تاریا مضراب!" اس مقالہ کے پڑھنے سے آج سے گیارہ برس پیشتر کا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ تحریکِ پاکستان کے ابتدائی ایام۔ چاروں طرف سے ہجومِ مخالفت نیشنلسٹ مسلمانوں (بالخصوص مولوی صاحبان) کی ملت سے غداری۔ ابوالکلام صاحب آزاد کی کھلی ہوئی امت فروشی۔ ان مخالفتوں کے طوفان میں قائداعظم مرحوم کا روشنی کے مینار کی طرح عزم و استقلال۔ اور ان سب کے ساتھ، ہر واقعہ عظیمہ پر طلوعِ اسلام کا قرآن کی روشنی میں بے باکانہ تبصرہ۔ یہ سب ایک ایک کر کے، سینما کے فلم کی طرح، پردۂ تصور پر منعکس ہوتے گئے۔ جی نہیں چاہتا کہ اس مقالہ (تاریا مضراب) کی لذت یابی سے بزمِ طلوعِ اسلام کو محروم رکھا جائے۔ اس لئے ہم اس مقالہ کو درج ذیل کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر کرم فرما حضرات نے ہم سے کہا ہے کہ اگر طلوعِ اسلام کے دورِ دہلی کے چیدہ چیدہ مضامین، لمعات اور تبصرات و تنقیدات کو یکجا شائع کر دیا جائے تو اس سے تحریکِ پاکستان کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے جس کا بدل کہیں نہیں مل سکتا۔ ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ اگر کبھی حالات نے مساعدت کی تو یہ کچھ بھی کیا جا سکیگا

ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے۔

بہرحال، سردست آپ اس مقالہ کو دیکھئے جو "تاریا مضراب" کے عنوان سے اگست ۱۹۴۰ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا اور جو

جواب ہے اس استفسار کا کہ (Show - Boy) کی تلمیح کا اشارہ کس طرف ہے۔

تار ہائے مضراب!

راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد کے انتخاب صدارت کے موقع پر ہم نے لکھا تھا کہ اس سے کم ازکم ایک فائدہ ضرور ہوگا کہ یعنی اب ان کے آقایانِ نعمت انھیں مجبور کریں گے کہ وہ اپنے بے پناہ سکوت کے ان پردوں کو اٹھا دیں جن میں وہ اپنی موجودہ غیر اسلامی روش زندگی کو ایک عرصہ سے چھپاتے چلے آرہے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کی مہرِ خاموشی "نئے نواز" وارد ھا کے اس باطل آفریں ریکارڈ سے ٹوٹی جو نشرگاہ رام گڑھ کے صدارتی گراموفون سے سنایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تجربہ یاس انگیز ثابت ہوا۔ اسلئے کہ ارباب کانگریس کی توقع کے خلاف راشٹرپتی صاحب کی جھجک پھر بھی پورے طور پر نہ اتری۔ اور اس کے بعد بجائے اس کے کہ وہ بہ کمال زیبائی و رعنائی جلوہ بار ہوتے، اِدھر اُدھر کے گوشوں میں چھپتے چھپاتے پھرتے رہے، اور اگر کہیں مجبوراً شریک محفل ہونا بھی پڑا تو کچھ اس انداز سے لجاتے شرماتے، سمٹے سمٹائے، نقاب کی اوٹ میں ایک طرف آکر بیٹھ گئے۔

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

لیکن اس حجاب ونقاب سے بھلا کام چل سکتا تھا؟ ہندوؤں نے انھیں اس غرض سے راشٹرپتی تھوڑا بنایا تھا۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ جہاں انگریز سے سودا کرنا ہو وہاں گاندھی جی جایا کریں۔ اور جہاں مسلمانوں سے الجھنے کا موقعہ ہو وہاں شطرنج کے اس مہرے کو آگے بڑھا دیا جائے۔ اس باب میں آزاد صاحب کیلئے سب سے مشکل مرحلہ صدر مسلم لیگ کے روبرو آنا تھا۔ اس لئے کہ ایک تو آزاد صاحب خود اپنے من کے چور سے واقف ہیں۔ دوسرے وہ جانتے ہیں کہ مسٹر جناح سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کی ملت فروشی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتے۔ آزاد صاحب کو خوب علم تھا کہ جب دو برس ادھر گاندھی جی نے مسٹر جناح سے کہا تھا کہ مصالحت کی گفت و شنید کیلئے میں اپنے ہمراہ آزاد صاحب کو بھی لانا چاہتا ہوں، تو اس غیور و جسور مردِ حق گو نے بذریعہ تار متنبہ کردیا تھا کہ اور جسے جی چاہے لائیے لیکن آزاد صاحب کو ہرگز ساتھ نہ لائیے۔ میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تمام باتیں آزاد صاحب کے سامنے تھیں۔ اس لئے انھیں مسٹر جناح جیسے مردِ خوددار کے سامنے آنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ لیکن انسان کی بعض مجبوریاں بھی کس قدر جگر سوز و جانکاہ ہوتی ہیں کہ اسے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جس کے نتائج وعواقب اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ مسٹر جناح کبھی اپنی طرف سے پہل نہیں کرتے۔ جناب آزاد، مسلم لیگ کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کے لئے جن حرکات کے مرتکب ہوئے وہ مسٹر جناح کے سامنے تھیں۔ بایں ہمہ انھوں نے آزاد صاحب کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ خاموش تھے اور غالباً اس لئے خاموش تھے کہ وہ آزاد صاحب کی مجبوریوں سے واقف تھے۔ وقت گذرتا جارہا تھا لیکن نہ معلوم وہ کونسی سخت مجبوری لاحق ہوئی کہ بقول غالبؔ:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا۔ میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

آزاد صاحب نے اس پاسبانِ حصارِ ملت کو خواہ مخواہ جا چھیڑا۔ اور ایک تار بھیجدیا جس میں لکھا:۔

بصیغۂ راز۔ آپ کا ۹ جون کا بیان (نظر سے گذرا) کانگریس کی قرارداد دہلی میں قومی حکومت سے دراصل ایک جامع کا بینہ مراد ہے جو کسی ایک خاص پارٹی تک محدود نہ ہو۔ لیکن کیا لیگ کی یہی پوزیشن ہے کہ وہ کسی ایسے عارضی انتظام پر متفق نہیں ہو سکتی جس کی بنیاد دو قوموں کی اسکیم پر نہ ہو؟ اگر واقعی یہی مطلب ہے تو براہ مہربانی بذریعہ تار اس کی وضاحت کر دیجئے۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۳ جون)

ذرا سوچئے کہ ایک شخص اس سے پیشتر برملا کہہ چکا کہ حضرت! میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پھر وہ ان کی صدارت کی حیثیت سے بھی واقف ہے۔ چار دن نہیں گذرے کہ وائسرائے صاحب نے سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے مسٹر جناح کو دعوت دی تو دوسری طرف سے گاندھی جی کو بلایا۔ نیشنل کانگرس کے صدر صاحب کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ ایسے شخص کو یوں مخاطب کرنا اس کے سینہ کے زخموں کو کریدنا نہیں تو اور کیا ہے! اور پھر تار میں لکھا کیا؟ دنیا جانتی ہے کہ مسٹر جناح اور ہندوؤں کے درمیان مابہ النزاع اصولی مسئلہ یہ ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم سمجھتے ہیں اور ہندو ان کے اس اسلامی دعوی کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ مسلم لیگ اور ہندوؤں میں متعدد بار اختلافی مسائل کے متعلق مصالحت کی کوششیں ہوئیں اور ہر بار بات یہیں آکر رک گئی کہ ہندو، مسلمانوں کو الگ قوم تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور جس حکومت کو وہ قومی کہتے ہیں وہ درحقیقت ہندوؤں کی حکومت ہے۔ سو وہ بات جسے براہ راست منوانے سے ہندو قاصر آگئے تھے اب ایک مسلمان مُہرے کی طرف سے آگے بڑھائی گئی۔ ان حالات کے پیش نظر آپ خود اندازہ فرمائیے کہ اس تار کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو مسٹر جناح پالیٹکس سے کام لیتے (کہ جسے قرآنی اصطلاح میں منافقت کہا جاتا ہے) اور دل میں بس کی گانٹھ، لیکن چہرے پر شہد کی سی بناوٹی شیرینی لئے ہوئے، نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیتے کہ

دعوت نامہ باعث ہزار عزت افزائی ہوا۔ یاد فرمائی کا بصمیم قلب شکریہ، اختلاف مسلک کے باوجود مجھے اس امر کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ملت اسلامیہ کی فلاح کے لئے جناب کی مساعی جمیلہ ہر فرزند توحید سے خراج تحسین حاصل کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ آپ کی مجوزہ سکیم بھی بہبود ملت کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل میری طبیعت کچھ ناساز سی ہے گھٹنے میں چوٹ آگئی جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے روک رکھا ہے۔ آپ کی بلند پایہ اسکیم چونکہ گہرے غور و تفکر کی مستحق ہے اس لئے میں اس پریشانی خاطر کے زمانہ میں اس کے متعلق سوچنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ذرا سکون میسر آجائے تو اپنے خیالات گوش گذار کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ آپ کا مخلص (محمد علی جناح)

اور یا وہ قلب و زبان کی ہم آہنگی سے کام لیکر ایک مردِ حق گو کی طرح جو کچھ دل میں تھا کھلے کھلے الفاظ میں کہدیتے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ہر طرف سے ستائش و توصیف کے نعرے بلند ہوتے۔ بلندیٔ اخلاق کے قصیدے پڑھے جاتے۔ ہر دلعزیزی حاصل ہوتی۔ جناب آزاد صاحب خوش ہو جاتے اور ان کے حواریں بشاش۔ اور دوسری صورت میں دنیا بھر کی برائی اور دشنام طرازی۔ ظاہر ہے کہ مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ پہلی صورت اختیار کی جاتی۔ نفس کا بت اسی کی تلقین کرتا ہوگا، کہ ہر دلعزیزی

بڑی دولت ہے۔ لیکن حق وصداقت کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ پھر مسٹر جناح نے کیا کیا؟ وہی کیا جو ایک مسلمان کو کرنا چاہیئے۔ انھوں نے مصلحت کوشی اور نفسِ فریب کار کی حیلہ جوئی کو جھٹک کر الگ کر دیا اور قلب وزبان کی کامل آہنگی سے وہ جواب بھیجا جو ہندوستان کی سیاست میں حق گوئی وبے باکی کی اپنی مثال آپ ہے انھوں نے تار کا جواب تار میں بھیجا، ایک تو مسٹر جناح کی زبان، اس پر تار کا ایجاز، ہندوؤں کی ابلہ فریبی اور مسلمان قومیت پرستوں کی ملت فروشی کی داستان چند الفاظ میں یوں قلمبند کر دی کہ شاعری اس پر سر دھنے اور ادب وجد میں آجائے۔ افسوس کہ اس تار کا لفظی ترجمہ ہو نہیں سکتا اور مفہوم کی ادائیگی کے لئے ان الفاظ کو پھیلانا گویا خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتیوں کا تجزیہ کرنا ہے۔ بہرحال اس جواب کا آزاد ترجمہ یہ ہے:۔

آپ کا تار ملا۔ میں اس رازداری کا قائل نہیں۔ چونکہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد کلیتہً کھو چکے ہیں اس لئے میں بذریعہ خط وکتابت یا کسی اور نہج سے آپ سے ان معاملات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آپ کو ایک نمائشی صدر[1] بنانے سے ہندوؤں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ کانگرس یقیناً ایک قومی جماعت ہے اور اس طرح باہر کی دنیا کو دھوکا دیا جائے۔ آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے۔ کانگرس ہندو جماعت ہے اس لئے اگر آپ کو عزت نفس کا کچھ پاس ہے تو اس جماعت سے فوراً مستعفی ہو جایئے۔ اس وقت تک آپ نے لیگ کی تخریب کیلئے انتہائی کوشش کر دیکھی اور آپ کو علم ہے کہ آپ کس طرح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں اب ان حرکات کو چھوڑ دیجئے۔

اگر ہمارے قومیت پرست مسلمانوں میں حق سننے کی تاب ہوتی تو مسٹر جناح کی اس صاف گوئی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے لیکن اگر انھیں حق کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا تو اس باطل پرستی کی روش پر کیوں اڑے رہتے) مسٹر جناح کا تار، تار نہیں۔ مضراب تھا۔ جس سے ان سب کے خاموش سازیوں جھنجھنا اٹھے۔ گویا

نغمے بے تاب تھے تاروں سے نکلنے کیلئے

قیامت کا شور برپا ہو گیا کہ دیکھو صاحب! یہ جواب کس قدر خلاف تہذیب ہے۔ لب ولہجہ کتنا درشت ہے۔ حضرت امام الہند کی شان اقدس میں کیسی سوء ادبی ہے۔ وہ برگزیدہ ہستی جو نہ صرف مسلمانانِ ہند۔ بلکہ مسلمانانِ عالم کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ اس کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ کوئی اخبارات میں بیان شائع کرا رہا ہے۔ کسی کو دیکھئے تو بر سرِ منبر آنسو بہا رہا ہے۔ کوئی اسٹیج پر کھڑا عوام کے جذبات بھڑکا رہا ہے۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ اس کے خلاف ریزولیوشن پاس کرتی ہے۔ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں اور اس میں اس جواب کو خلاف اسلام بتایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو ہندوستان ٹائمز بابت ۱۴ر جولائی لغایت ۱۸ر جولائی (جس دن یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

ان حضرات سے پوچھئے کہ ذرا سنجیدگی اور متانت سے غور کر کے بتائیں کہ اس جواب میں کونسی بات خلاف اسلام اور خلاف تہذیب ہے جس پر یوں شور مچایا جا رہا ہے۔ اس میں گالی تو ایک طرف سوقیانہ پن کی بھی کوئی بات نہیں غور فرمایئے کہ اس تار میں

[1] Show-Boy

اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ ایک حقیقت کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ منافقت کے خوش آئند پردوں میں نہیں چھپایا۔ کالے کو کالا کہدینا اگر گالی ہے تو پھر سچ کے لئے دنیا میں کوئی لفظ باقی نہیں رہے گا۔ اگر جھوٹے کو جھوٹا کہدینا خلاف تہذیب ہے تو اسلام کی لغت میں ایسی تہذیب کے لئے منافقت و مداہنت کے سوا اور کیا لفظ ملے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات جو تہذیب اخلاق کے نام پر یوں تڑپ اٹھتے ہیں۔ گویا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

انھیں معلوم ہی نہیں کہ اسلامی تہذیب اور قرآنی اخلاق کہتے کسے ہیں! ہمارے ہاں یورپ سے جہاں اور لعنتیں آئیں۔ وہاں ایک بہت بڑی لعنت تہذیب اور اخلاق کا غلط نظریہ بھی ہے۔ یورپ کا معیارِ تہذیب یہ ہے کہ سوسائٹی کے عیب کو عیب کبھی نہ کہو۔ کسی پر نکتہ چینی نہ کرو۔ آپ کے سامنے ایک شخص سرتاپا جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن اخلاق کا تقاضا ہے کہ اسے ٹوکئے نہیں۔ آپ کے دل میں کسی کے خلاف لاکھ جذباتِ منافرت موجزن ہوں لیکن اس سے جب ملئے نہایت خندہ پیشانی سے ملئے۔ اندر سے دل مارِ سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ لیکن ہنس کر کہئے کہ آپ کی ملاقات سے بیحد مسرت ہوئی۔ غرضیکہ آپ جس قدر منافقت برتئے اتنے "پاپولر" (ہر دلعزیز) ہو جایئے۔ یہ تھا یورپ کا نظریہ تہذیب و اخلاق جو مغرب سے اٹھا اور مشرق کے آب و گل میں سرایت کر گیا۔ ہندوستان کی سیاسی فضا میں "مہاتمائیت" کے چولے نے اس نظریہ کو تقدس کا رنگ دیدیا، دل میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے بدترین دشمن اور بظاہر مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ سینہ میں پراچین تہذیب کے احیاء اور رام راج کے قیام کے منصوبے اور زبان پر متحدہ قومیت اور آزادی ہند کے تذکرے خلوت میں آتشِ انتقام سے شعلہ در پیرہن اور جلوت میں ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت، یہ رنگ سیاست اوپر سے نیچے کو گرا۔ اور تمام فضا کو ملوّن کر گیا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے اربابِ کانگرس کی یہ کیفیت ہے کہ عدم تشدد (اہمسا) کو مدتوں بطور عقیدہ تسلیم کرنے کا اعلان کرتے رہے مگر دل میں اس کی سچائی کا کبھی یقین نہیں رکھا۔ حال ہی میں کانگرس کے ریزولیوشن متعلقہ عدم تشدد پر جب یہ خیال پیدا ہوا کہ کانگرس نے اپنا قدیم مسلک چھوڑ دیا ہے تو اس پر امرت بازار پتریکا جیسے اخبار نے لکھا ہے کہ

> حقیقت یہ ہے کہ اربابِ کانگرس میں سے اکثریت ایسوں کی ہے جنھوں نے عدم تشدد کو کبھی بطور عقیدہ کے تسلیم نہیں کیا بلکہ محض حکمتِ عملی کے طور پر مانتے رہے۔ اور اگر سچ کہا جائے تو یہ لوگ جو اس امر کا اعلان کرتے رہے کہ ہم خیالات الفاظ اور اعمال میں عدم تشدد کے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں۔ تو یہ اعلان کسی دیانت دارانہ قلبی یقین پر مبنی نہ تھا بلکہ محض مہاتما گاندھی کے جذبات کی رعایت سے تھا۔" (اسٹیٹسمین ۱۲ جون)

مغرب کی مادہ پرستی اور ہندوستان کی سیاسی حکمتِ عملی کا یہی وہ معیارِ اخلاق و تہذیب ہے جو ہمارے قومیت پرست حضرات کے دل و دماغ پر مستولی ہے اور جس کی بنا پر ان میں حق کہنے کی تو ایک طرف حق سننے کی بھی ہمت باقی نہیں رہی۔ اسی ماؤفِ قلب و نظر کا نتیجہ ہے وہ ہنگامہ جو مسٹر جناح کے جواب کو خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق قرار دے رہا ہے۔ سچ فرمایا تھا جناب اکبر نے ؎

مغوی کو برا مت کہو ترغیب ہے یہ — یہ کس سے کہوں نفس کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہدیا تھا ایک دن — اک شور اٹھا خلافِ تہذیب ہے یہ

یاد رہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے خلافِ حقیقت ہے۔ شکایت صرف یہ ہے کہ اس جواب کا پیرایۂ بیان سخت ہے، طرزِ ادا درشت ہے، ان علمبردارانِ تہذیب و اخلاق نے جناب آزاد کی حمایت میں اس قدر آسمان سر پر اٹھا لیا اور مسٹر جناح کے جواب کو اسلامی معیارِ تہذیب و اخلاق کے خلاف قرار دیدیا۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ ان ارادتمندانِ بے بصر نے خود جناب آزاد سے کیوں نہ پوچھ لیا کہ قرآنی معیارِ اخلاق و تہذیب کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر جناح کے جواب کے بعد خود جناب آزاد کی یہ حالت ہے کہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!

لیکن کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ جناب آزاد تمام معاملات کو کتاب و سنت کے آئینہ میں دیکھا کرتے تھے۔ اور جو کچھ اس میں دکھائی دیتا پورے جوشِ خطابت سے کہدیا کرتے تھے۔ سنئے کہ اس باب میں ان کا اپنا ارشاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں:-

اسلام نے حق پرستی کی جو تعلیم دی ہے۔ وہ دنیا کے موجودہ اخلاق کی مدعیانہ حق پرستی سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ قرآن حکیم اور اسوۂ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ہمیں حق کا اصول بتلا دیا ہے۔ ایک طرف تو یہ تعلیم دی فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں مخالفوں کے ساتھ نرم دل بنا دیا ہے کہ باوجود ان کی سختی اور قساوت کے تم حسن اخلاق و صبر و تحمل سے پیش آتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی بھی تمہارے پاس نہ آتا۔

دوسری جگہ حکم دیا، واغلظ علیہم باطل پرستوں کے ساتھ نہایت سختی کرو کہ وہ نرمی کے مستحق نہیں۔

پہلا موقعہ تو عام طور پر حسن خلق، کشادہ روئی، صبر و تحمل، نرمی طبیعت، تہذیب لسان و لہجہ سخن کا تھا لیکن دوسرا موقعہ حق و باطل، صدق و کذب اور ایمان و کفر کے مقابلے کا تھا۔ فرمایا کہ جس قدر سختی کر سکتے ہو کرو کہ عین عدل و اخلاق ہے۔

چنانچہ سورۂ قلم میں ایسی نرمی کو جو حق و صداقت کے خلاف ہو اور راہِ عدالت سے منحرف کر دے "مداہنت" کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ ودوا لو تدھن فیدھنون۔ بعض کفار آنحضرت (صلعم) کے پاس جمع ہو کر آئے اور کہا کہ بہتر ہے کہ ہم میں اور آپ میں ایک راضی نامہ ہو جائے۔ . . . . . آپ جو کچھ تعلیم دینا چاہتے ہیں دیجئے۔ لیکن صرف اتنا کیجئے کہ ہمارے بتوں کو اور ہماری بت پرستی کو برا نہ کہئے۔ اس کے بدلے میں ہم آپ کو مال و دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ بلکہ حجاز کا بادشاہ تسلیم کر لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اس نے جو نہ صرف ریگستانِ عرب کا بلکہ تمام بر و بحر عالم کی ہدایت کا شہنشاہ ہونے والا تھا بیساختہ جواب دیا۔ لو جئتمونی بالشمس حتی تضع فی یدی ما سألتکم غیرھا (بخاری) عرب کی بادشاہت تو کیا شے ہے؟ اگر تم سورج کو بھی آسمان سے اتار کر میری مٹھی میں رکھدو۔ جب بھی میں سوائے کلمۂ حق کے دوسری بات منظور نہ کروں گا۔

خدائے تعالےٰ نے اسی مصالحت اور نرمی کی خواہش کی نسبت فرمایا ودوا لو تدھن فیدھنون یہ باطل پرست کہتے ہیں کہ تو ان کے ساتھ اعلانِ حق میں نرمی کر۔ تو وہ بھی تیرے ساتھ نرمی کریں گے حالانکہ کفر کو راضی رکھ کے ایمان کی دعوت کبھی نہیں دی جاسکتی۔ فلا تطع المکذبین پس ان لوگوں کی خواہشوں کی اطاعت نہ کرو۔ جو حق و صداقت کو جھٹلانے والے ہیں۔"

(الہلال ۲/۴)

یہ اصول تھا۔ اب اس کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"اس انسان پرستی ہی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ بالعموم طبیعتیں مدح و تحسین کی عادی ہوگئی ہیں۔ نکتہ چینی اور نقد و اعتراض کی متحمل نہیں ہوسکتیں ہر شخص مخاطب سے اگر کوئی قدرتی امید رکھتا ہے تو وہ یہی ہوتی ہے کہ مدح و منقبت کا ترانہ سنائے۔ اور بادۂ تحسین و آفرین کی پے در پے بخشش سے ساقی کا ہاتھ کبھی نہ تھکے۔ شرک و بت پرستی کے اس عام سکون میں اگر کوئی صدائے توحید خلل انداز ہوتی ہے تو ہر طرف سے اپنے ایک قدیمی پیشرو کی طرح لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنک من المسجونین (اگر میرے سوا کسی دوسری ذات کو تو نے اپنا معبود بنایا تو میں تجھ کو قید کردوں گا (۲۶ - ۲۹) کا غل مچ جاتا ہے۔ اور صرف یہ معبودانِ باطل ہی نہیں بلکہ ان کے پرستار بھی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ایک قدیمی سنت ہے اور دنیا میں جب کبھی سچائی آئی ہے۔ تو اس کو ہمیشہ ایسے ہی لوگوں سے مقابل ہونا پڑا ہے فما کان جواب قومہ الا ان قالوا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین (۲۱: ۶۸)

ایسے موقعوں پر عموماً اخلاقی مواعظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں پر حملہ کرنا انسانیت اور تہذیب کے خلاف ہے گالیاں دینا کوئی اچھی عادت نہیں۔ اختلافِ رائے ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ کہ مخالف آرا رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔ پھر اگر ایسا کرنے کے لئے آپ مجبور ہیں۔ تو ذرا لہجہ نرم کیجئے۔ اور شکایت بھی کیجئے۔ تو فکر کے لہجہ میں کیجئے۔ نرمی اور محبت سے کام نکلے۔ تو سختی دکھلانا شانِ شرافت نہیں۔ آج کل بھی کہ ہوشیاری و بیداری کی نہیں۔ تو خماری و سرشاری کی ایک کروٹ تو مسلمانوں نے ضرور بدلی ہے۔ نکتہ چینیوں کی باتوں کو ایسے ہی ظاہر فریب اور اخلاق نما جملوں سے بند کیا جارہا ہے۔ پس ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اصولاً اس مسئلے پر غور کریں کہ فی الحقیقت اس بارے میں کوئی فیصلہ ہمارے پاس ہے یا نہیں؟ کسی کو برا کہنا یقیناً اچھی بات نہیں۔ دل محبت کے لئے ہے نہ کہ عداوت کے لئے۔ لیکن کیا ایسی صورتیں بھی ہیں جن میں یہ برائی ہی سب سے بڑی نیکی اور بھلائی ہوسکتی ہے؟

سب سے پہلے اسے اخلاق کے عام اصول کے لحاظ سے دیکھئے جب بھی فیصلہ صاف ہے، دنیا میں جب دن اخلاق نے کہا کہ نیکی کو نیک اور نیک عمل کو اچھا کہو۔ کیونکہ بغیر اس کے دنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی وقت اس نے ضمناً یہ بھی کہہ دیا۔ کہ نیکی کی خاطر بدی کو برا اور بدعمل کو قابلِ نفرت سمجھو۔ کیونکہ نیکی کو اس کا حقِ تحسین مل نہیں سکتا۔ جب تک بدی کو اس کی سرزنش اور تعزیر نہ مل جائے۔"

(الہلال ۱۱ اگست ۱۹۱۲ء)

پیرائیہ بیان اور طرزِ ادا کے متعلق بھی سن لیجئے فرماتے ہیں۔

"(حق) اور (باطل) دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں میں سے کسی ایک کو پسند کرلیجئے اگر حق کی راہ اختیار کی ہے۔ تو پھر مصلحت

پیرایۂ بیان، طرز ادا، الفاظ شہد نما، معانی زہر آلود، اور اسی قبیل کی تمام باتوں کے لئے نفاق کے سوا اور کوئی لقب نہیں۔ سچ کہیئے گا تو جھوٹ کو چوٹ ہی لگے گی۔ اس کو بچانے کی کوشش نہ کیجئے۔ ورنہ آپ کفر سے زیادہ دنیا کے لئے مہلک ہیں نرمی اور آشتی، حسن ادا، پیرایۂ بیان۔ مصلحت بینی۔ اور مقتضیات زمانہ کے اگر یہی معنی ہیں۔ جو بتلائے جاتے ہیں۔ تو خدا کے لئے ہمیں سمجھا دیجئے کہ پھر نفاق و منافقت کے اور کیا معنی ہیں؟ اگر ایک بات سچ ہے تو اس کو صاف صاف کہہ دیجئے۔ اگر کچھ لوگ برے ہیں تو کھول کھول کر ان کی برائی بیان کر دیجئے۔ بری باتوں کے اظہار کے لئے اچھے لفظ کیوں اختیار کئے جائیں؟ بد اعمالوں کو کیا حق حاصل ہے کہ نیک کرداروں کے حقوق کا مطالبہ کریں؟ اگر یہ طریقہ پسند نہیں۔ تو پھر بتوں کو آستین میں چھپانے کی جگہ بہتر ہے کہ سر پر جگہ دیجئے۔ ظاہر و باطن میں مطابقت، جھوٹ میں بھی ہو تو سچائی سے خالی نہیں۔

بس کافرست زاہد از برہمن ولیکن　　اور ابت است در سرور آستیں ندارد

یا ایہا الذین آمنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون۔ ......

مشکل یہ ہے کہ لوگ تیشے کی ضرب کی سختی کو دیکھتے ہیں۔ مگر اسے نہیں دیکھتے۔ کہ عمارت کی بنیاد بھی تو برسوں کی پرانی ہے، اگر پرانی بنیاد کو اکھاڑنا مقصود ہو تو اس پر ابتدائی ضربیں سخت سے سخت لگایئے، جب جڑ ہل جائے گی۔ تو پھر آپ کو اختیار ہے، انگلیوں سے مٹی ہٹا کر اینٹوں کو ایک ایک کرکے اٹھا لیجئے گا، لیکن اگر پہلی ضرب ہی سست پڑی۔ تو پھر برسوں میں بھی نئی عمارت کے لئے جگہ صاف نہ ہو سکے گی۔ یہی سبب ہے کہ ہم اس وقت اپنے کاموں کے لئے سخت سے سخت تلخی کو بھی نرمی سمجھتے ہیں، جہاں تک کندھوں میں زور ہو، جلد جلد ضربیں لگاتے جایئے۔ زمانے کا سیلاب بھی آپ کی مدد کے لئے تیزی سے امڈ آرہا ہے، اگر آپ نے اپنا کام پورا کر دیا تو پھر آپ کو ہمیشہ کے لئے فرصت ہے۔ یہ سیلاب خود بنیاد کی مٹی تک بہا لیجائے گا۔"　　(الہلال - ۱۸ اگست ۱۹۵۱ء)

ملاحظہ فرمایا آپ نے، جس چیز کو آپ تہذیب و اخلاق کہتے ہیں وہ قرآنی زبان میں بقول جناب آزاد منافقت کہلاتی ہے، آج ہمارے ان علمبرداران دین و شریعت کے سینہ میں آتش غیظ و غضب اس لئے شعلہ بار ہے کہ مسٹر جناح نے منافقت کیوں نہیں اختیار کی ڈاکٹر محمود صاحب فرماتے ہیں۔

یقیناً مسٹر جناح کسی اور ہی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہمارا کلچر نہیں ہے اور کسی اور قوم کی جو ہماری قوم نہیں ہے۔

(ہندوستان ٹائمز بجلد ۱۴)

بالکل بجا اور درست! آپ نے خود جناب آزاد کے الفاظ میں سن لیا کہ اسلامی کلچر اور تہذیب کیا ہے اور آپ حضرات کا اسلام اور اس کی تہذیب کیا ہے! مسٹر جناح کے جواب میں کوئی لفظ دشنام طرازی کا نہیں۔ لیکن سنئے کہ ایسے مواقع پر امام الہند صاحب کن الفاظ میں اظہار جذبات فرماتے ہیں۔ حضرات علماء کرام زیادہ توجہ فرمائیں کہ روئے سخن انہیں کے ایک گروہ کیطرف ہے ارشاد ہے۔

"سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع

ویسے تو خاموش رہتا ہے۔ لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگان دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سٹرہی ہو وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے۔ جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے۔ اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کر دیتی ہے، فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کیطرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنانی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کیطرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی اور امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر پڑتا اور خون خواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے" تذکرہ ص۱۰۰

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح کا تار ایک آئینہ تھا جس میں قومیت پرست حضرات کو اپنے صحیح خد و خال نظر آئے لیکن وہ تھے اتنے بھیانک کہ انہیں دیکھ کر یہ حضرات بلبلا اٹھے۔ ایسے میں اگر دماغی توازن قائم رہتا تو توجہ اپنے بگڑے ہوئے چہرے کی اصلاح کیطرف منعطف ہوتی۔ لیکن وفور غضب نے عقل و ہوش کو مسلوب کر دیا۔ آئینہ توڑ ڈالا اور آئینہ نما کو کوسنے لگے اتنا نہ سوچا کہ آئینہ توڑ دینے اور آئینہ نما کو برا بھلا کہہ دینے سے مسخ شدہ چہرہ تو درست نہیں ہو جائے گا۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اعلان کرتے تھے کہ جو شخص مجھے میرے عیوب سے آگاہ کریگا میں اس کا شکر گذار ہوں گا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ تنبیہ کرنیوالے کو حوالۂ دار و رسن کیا جاتا ہے اور طبائع اس قدر مداہنت و منافقت کی خوگر ہو چکی ہیں۔ کہ حقیقت کو اس کے اصلی رنگ میں بیان کر دیا جائے تو اس سے بگڑ بیٹھتے ہیں اور خوش اس سے ہوتے ہیں

"کہدے کوئی الو کو اگر رات کا شہباز"

کہا جا سکتا ہے کہ جناب آزاد اور دیگر قومیت پرست حضرات کا مسلک ملک فروشی اور غداری نہیں محض طریق کار کا اختلاف ہے۔ مقصد ان کا بھی مسلمانی کی فلاح و سعادت ہے۔ اسلام کی سرفرازی و سربلندی ہے بجا اور درست ہے

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن سوال یہ ہے۔ کہ اس امر کا فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ کہ ان حضرات کی روش ملت فروشی ہے یا اسلام دوستی؟ ورنہ یوں تو میر جعفر سے بھی پوچھتے تو وہ بھی یہی کہتا کہ میں نے جو کچھ کیا قوم کی بہتری کے لئے کیا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لئے اس باب میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے ہر اختلافی مسئلے کا فیصلہ خدا کی کتاب مبین کی رو سے ہوگا۔ ہم مسلسل اڑھائی برس سے جناب آزاد کی اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کہ کتاب و سنت کی رو سے قومیت پرستوں کا موجودہ مسلک یکسر غیر اسلامی ہے۔ جناب آزاد اپنے دور قومیت پرستی سے پیشتر ایک عرصہ تک اپنی موجودہ روش کو عہد جاہلیت کی روش قرار دیتے رہے ہیں، کانگریس کی شرکت کفار کی دوستی غیر مسلموں کی رہنمائی متحدہ قومیت وغیرہ

کو کفر و باطل کی راہ بتاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی باطل کی راہ اختیار کرلی۔ تو قوم کے مسلسل تقاضوں کے باوجود انہوں نے اس مسلک کے جواز میں کتاب و سنت سے ایک دلیل بھی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی فرمایئے! اس کے بعد مسلمان کس طرح اپنے آپکو دھوکا دے لے۔ کہ ان کا (اور دیگر قومیت پرست حضرات کا) مسلک اسلام کے مطابق ہے۔ جو کچھ پہلے ہوا۔ اس کو چھوڑ دیجئے۔ ہم جناب مانشرتی ابوالکلام صاحب آزاد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں قرآنی سند پیش کریں۔ اس کے بعد ہم انشاء اللہ نصوص صریحہ اور خود ان کی تحریروں سے ان کے دعوے کی تردید کریں گے۔ دنیا خود دیکھ لے گی کہ حق و صداقت کی راہ کونسی ہے پچھلے دنوں جناب حسین احمد صاحب مدنی مونگیر تشریف لے گئے۔ وہاں جناب عبدالقدوس صاحب بہاری نے انہیں چیلنج دیا۔ کہ وہ اپنے مسلک قومیت پرستی کے متعلق ان سے تحریری یا تقریری مناظرہ کریں۔ جناب مدنی صاحب شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (منشور مورخہ ۲۰ جون ۱۹۵۱ء) یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے اور اس پر مطالبہ یہ ہے کہ قوم آنکھیں بند کئے ان کے پیچھے پیچھے چلی آئے۔ اب فرمایئے کہ مسٹر جناح کی حقیقت گوئی انہیں کیوں نہ کڑوی معلوم ہوگی؎

گرفتم حضرت ملا ترش روست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ میراند حق اوست

باقی رہا یہ دعوے کہ جناب آزاد صاحب کو تمام مسلمانان ہند کا اعتماد حاصل ہے۔ سو اس کا امتحان بھی بہت آسان ہے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہاں کے ارباب حکومت سے بھی آزاد صاحب کی ساز باز ہے وہ آئیں اور پنجاب کے صدر مقام لاہور سے کسی انتخاب کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ دنیا کو حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ جناب کو کتنا اعتماد حاصل ہے۔ اور مسٹر جناح نے کس قدر سچ کہا ہے کہ "آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے"

اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بت کو خدا سمجھے

حج کی اہمیت

(پرویز)

ذیل میں ہم محترم پرویز صاحب کی وہ تقریر شائع کر رہے ہیں جو حج کے موقعہ پر ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر ہوئی۔ (ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ) طلوع اسلام

انسان کی ابتدائی زندگی پر غور کیجئے۔ زمین پر بڑے بڑے پُر آشوب دریا اور ان کی حدود فراموش طغیانیاں۔ مہیب جنگل اور ان میں بسنے والے خوفناک درندے۔ آسمان پر کڑکتی ہوئی بجلیاں اور گرجتے ہوئے بادل۔ اس ہیبت انگیز ماحول اور لرزہ انگیز حالات میں گھرا ہوا انسان۔ نہتا اور تنہا! انہی خطرات کے ہجوم نے اس کے جذبۂ معاشرت (the herd instinct) کو بیدار کیا اور اس نے الگ الگ رہنے کے بجائے خاندانوں میں مل جل کر رہنے کا طریقہ اختیار کیا۔ انسانی معاشرتی زندگی کی یہ پہلی شکل تھی۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو خاندانوں نے قبائل کی صورت اختیار کر لی۔ اس اجتماعی زندگی سے اس نے فطرت کی قوتوں کو رفتہ رفتہ مسخر کرنا شروع کر دیا لیکن خود انسانوں کے مشترک مفاد کے ٹکراؤ سے خاندانوں اور قبیلوں میں باہمی مخاصمتیں شروع ہو گئیں اور اس طرح خارجی خطرات کی جگہ داخلی عداوت نے لے لی۔ یہی قبائل پھیل کر قومیں بن گئے۔ اسوقت تک دنیا قوموں میں بٹی چلی آ رہی ہے اور مختلف قوموں کی باہمی عداوت اور رقابت کا جو عالم ہے وہ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی اعتبار سے اس دورِ تہذیب و تمدن کا انسان بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے جہاں ابتدائی دورِ وحشت و بربریت کا انسان تھا۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ اسوقت اسے صرف ایک دوسرے پر پتھر پھینکنا آتا تھا اور آج یہ ترقی کرتے کرتے ایٹم بم پھینکنا بھی سیکھ گیا ہے قومیت پرستی کی اس لعنت سے صرف یہی نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں امن و سکون باقی نہیں رہا۔ اس نے انسانیت کے بنیادی تصورات تک بدل دئے ہیں۔ ڈاکٹر ہکسلے کے الفاظ میں۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور خدائے واحد کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی بہ حیثیت انسان کی کچھ قیمت نہیں سمجھتی، دوسری طرف یہ باہمی تفرقہ انگیزی کا موجب ہے، انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھیراتی ہے۔

اہل مغرب پر یہ حقیقت پہلی جنگ کے بعد ہی بے نقاب ہو گئی تھی کہ ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی بنیادی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے۔ لیکن چونکہ انسانی عقل ابھی تک قومیتوں کے دائرے سے آگے بڑھ نہیں سکی اس لئے انہوں نے اس کا علاج جمعیت الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کی تشکیل

میں سوچا۔ لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی یہ جماعت جس بری طرح ناکام رہی واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (Reeves) اپنی کتاب ANATOMY OF PEACE میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔" دوسری جنگِ عظیم کے بعد اقوامِ مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربہ کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام U.N.O. رکھ دینے سے ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی۔ U.N.O. کامیاب ہوتی ہے یا ناکام، اس کا فیصلہ وقت کریگا۔[۱] یہ ہے انسانی معاشرہ کی وہ شکل جسے انسانی عقل آج تک تجویز کر سکی ہے۔ لیکن انسانی عقل سے ماوراء ایک اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ وحی نے اس مسئلہ کا حل کیا بتایا ہے۔

آج سے قریب چودہ سو سال پہلے کی دنیا کا تصور سامنے لائیے جب سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات اسقدر محدود تھے کہ ایک بستی کے رہنے والے دوسری بستی کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے۔ اور یہ چیز کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ مختلف قوموں کے افراد میں کوئی شے قدرِ مشترک بھی ہو سکتی ہے۔ عین اس زمانہ میں وحی کی زبان نے یہ اعلان کیا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔ یاد رکھو تمام نوعِ انسان ایک برادری ہے۔ اس لئے نسل اور وطن کی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم تمہاری خود ساختہ اور حقیقت کے خلاف ہے۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ اللہ نے تمام انسانوں کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جب تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ان کے معاشرے کی بنیادیں بھی ایک ہی آئین پر استوار ہونی چاہئیں۔ یعنی دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں کہئیے ONE MANKIND AND ONE WORLD GOVT. اس کے بعد اس نے کہا کہ اس حقیقت کے پیشِ نظر تمام دنیا کے انسانوں کے دو حصے ہو جائیں گے ایک وہ جو اس آئیڈیالوجی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لیں۔ انہیں ماننے والوں کی جماعت یا اُمتِ مسلمہ کہا جائے گا۔ دوسرے وہ جو اس روشِ زندگی سے انکار کریں اور انسانوں کی قومی گروہ بندیوں کو قائم رکھتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں۔ انہیں غیر مسلم کہا جائے گا۔

اُمتِ مسلمہ کے سالانہ اجتماع کا نام حج ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ تمام دنیا میں اُس آئین کے مطابق حکومت ہونی چاہیئے۔ جو وحی نے مرتب کیا ہے۔ اپنے اپنے ملکوں سے نمائندے چنیں، یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی قیادت میں مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کیطرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان کا باہمی تعارف ہو پھر یہ سب نمائندگانِ ملت اپنے میں سے ایک صدر کا انتخاب کریں اور تمام دنیا کے حالات کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایسا پروگرام مرتب کریں جسے آئندہ سال کے لئے بطورِ مشترکہ اصول اختیار کیا جائے۔ ان کا منتخب کردہ صدر اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان اس پروگرام کی جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ مختلف ممالک پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔ ان مذاکرات کے بعد یہ نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو واپس آ جائیں۔ اور اس طے شدہ پروگرام کی روشنی میں اپنے اپنے ہاں کا نظم و نسق

---

[۱] یہاں اصل مسودہ میں کچھ تبدیلی اور حذف کیا گیا ہے۔

چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام دنیا کے انسانوں کو ایک امت بنانے اور ان کے معاشرتی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بنایا ہے۔ قرآن نے حج کے اس مقصد کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے آپ ان مختصر الفاظ پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غائت اس سے بلند، اور کوئی انداز بیان اس سے بلیغ ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کا اجتماع ایسا ہے جس کے فائدے سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ اور اس کی غرض و غائت کیا ہے؟ قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ انسانیت اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے۔ غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمان، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام اور انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ ہو۔ کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسان کے قیام کا موجب۔ یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ آج دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر اس نقطہ تک تو آپہنچی ہے کہ دنیا سے قومیتوں کی تفریق کو مٹا کر اس کی جگہ ایک عالمگیر برادری کا قیام نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر GAULD اپنی کتاب MAN. NATURE AND TIME میں لکھتا ہے کہ

اب یہ چیز بالکل فطری نظر آتی ہے کہ تمام نوع انسانی کی ایک منظم برادری قائم کر دی جائے۔

اور ساری دنیا میں ایک حکومت کا خیال بھی روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ چنانچہ H.G. Wells نے ۱۹۴۲ء میں سائنس کانفرنس میں کہا تھا کہ

بُعد مکانی جو دنیا کی الگ الگ حکومتوں کے لئے وجہ جواز تھا اب ختم ہو چکا ہے اب ان حکومتوں کی حدود ایک دوسرے پر پھیل چکی ہیں۔ تمام نوع انسانی اب ایک ملت بن چکی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ ناممکن تھا کہ تمام دنیا کے معاملات کو ایک نظام امن کی شکل میں منضبط کیا جا سکتا۔ اُس وقت ایک حکومت صرف ایک خاص رقبے میں ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتی تھی عالمگیر نظام قائم نہیں کر سکتی تھی۔ اب بُعد مکانی کے ناپید ہو جانے سے ایک عالمگیر نظام نہ صرف ممکن العمل ہو چکا ہے بلکہ موجودہ جنگ اور اس کے بعد کے لوازمات کے پیش نظر اس کی ضرورت بھی اشد ہو چکی ہے۔

یعنی تمام دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہو رہا ہے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس خیال کو عمل میں کس طرح لایا جائے! اس کا حل بھی وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے لئے اصولی طور پر آئین بھی ایک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا آئین وہی ہو سکتا ہے جو مختلف اقوام کی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کے بجائے تمام نوع انسانی کی مشترکہ نشوونما کے اصول پر قائم ہو۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نظام ربوبیت ہے، جس دن دنیا کی سمجھ میں یہ بات آگئی اسی دن ایک عالمگیر حکومت کا خیال عملی شکل اختیار کرے گا۔ حج کا اجتماع اسی نظام کی طرف دعوت کا پیغام ہے۔

یہ ہے حج کا قرآنی مفہوم[1]۔ آج عالم اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ غیر مسلم قومیں ان کے خلاف متحدہ محاذ

---

[1] کچھ حصہ حذف کر دیا گیا۔

قائم کئے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک کے مسلمان مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں، انسانی نعمتوں کا متحدہ طور پر مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی کہ جو طریق ربط و نظم ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا اسے ہم ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں۔ اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر کہیں ہمارے اس اجتماع میں صحیح زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی تو اس وقت عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہو رہا ہے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلوں پر لگی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقام ہی یہی تجویز کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی مرکزی امت بنایا ہے اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ تمام نوع انسانی کو حق و انصاف کے راستہ پر چلاؤ، اور انہیں ظلم و سرکشی کی راہوں سے روکو۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کو اس قسم کی پوزیشن اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے پاس اتنی قوت ہو کہ وہ اپنے فیصلوں کو تمام اقوام عالم سے منوا سکے۔ اس قسم کی قوت مرکزیت کے بغیر ناممکن ہے آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہے جغرافیائی حیثیت سے دیکھیے تو انہیں ایک ایسی مرکزی پوزیشن حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور قوم کو میسر نہیں۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جو مسلسل یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسباب اتحاد و یگانگت کو دیکھیے تو ان سب کا سرچشمہ فکر اور محرک عمل ایک ہے۔ لیکن حالات کی ایسی قابل رشک سازگاری کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ اقوام عالم کی امامت و قیادت تو ایک طرف، ان کی ہمسری اور برابری بھی نصیب نہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری مرکزیت گم ہو چکی ہے اگر یہ مرکزیت زندہ ہو جائے تو ہماری بے پناہ قوتوں کا کوئی مقابل ہی نہیں۔ یہ مرکزیت کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اسکی دوبارہ زندگی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارا حج کا اجتماع قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے متنوع مضامین کا مجموعہ

قیمت چار روپے

ادارہ طلوع اسلام کراچی

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

کے

چند عنوانات

آنحضرت کا بچپن ـــــ اسوہ محمدیہ پر ایک نظر ـــــ گنبد خضراء

حضرت ابوذر غفاریؓ ـــــ حضرت اویس قرنی ـــــ مثنوی اسرار خودی

پیام مشرق ـــــ جاوید نامہ ـــــ ضرب کلیم ـــــ اسباب زوالِ امت

عربی خط ـــــ نابینائی ـــــ سفر حج ـــــ میری طالب علمی

ضخامت چار سو صفحات

قیمت چار روپے

ادارہ طلوع اسلام
کراچی